جناب مولانا افتخار فریدی کو دعوت و تبلیغ دین کے کام سے خاص دلچسپی اور طبعی مناسبت ہے اور وہ اسلام کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کی اصلاح و سربلندی کے لیے برابر فکرمند بھی رہتے ہیں اسی مقصد سے وہ مفید دینی و اصلاحی کتابچے خود بھی مرتب کرکے اور دوسروں سے بھی مرتب کراکے شائع کرتے رہتے ہیں، یہ تینوں کتابچے بھی ان کے دعوتی شوق و ذوق اور تبلیغی جوش و جذبہ کے نتیجہ میں شائع ہوئے ہیں، اول الذکر دونوں رسالے مولانا محمد عبدالملک جامعی کے قلم سے ہیں، جو مراد آباد کی سکونت ترک کرکے عرصہ سے مدینہ منورہ میں آباد اور مختلف دینی و دعوتی سرگرمیوں میں منہمک اور مدرسہ تحفیظ القرآن کے نگراں ہیں، مولانا فریدی کی طرح اسلام کی دعوت و اشاعت اور امت کی صلاح و فلاح کے لیے انھوں نے بھی اپنی زندگی وقف کردی ہے، پہلے کتابچہ میں ہر مسلمان کو اسلام کا داعی و مبلغ بننے کی تلقین کی ہے، اور یہ دعوت دی ہے کہ اسلام کا پیغام حق و صداقت سنا کر پوری دنیا کو بنانے اور سنوارنے کے لیے اسے کمربستہ رہنا چاہیے، دوسرے کتابچے میں ایک بے ادب اور گستاخ کے اس نار وا فقرہ "خدا ظالم ہے، اور ظالموں کا ساتھ دیتا ہے" کی مختلف انداز سے تردید کرکے دکھایا ہے کہ دراصل خود انسان ظالم ہے، اس ضمن میں خدا کی ربوبیت رحمت، حکمت، غیبی امداد، مظلوموں کی دستگیری اور ظالموں سے انتقام لینے کی عجیب عجیب صورتوں کا ذکر کیا ہے، اس میں ایک جگہ مولانا شبلیؒ کے بارہ میں لکھا ہے کہ انکے اولاد نہ تھی (ص ۱۴)، یہ صحیح نہیں ہے انکے بیٹے بیٹیاں دونوں تھیں، تمام لوگوں کے ناموں کے ساتھ مولانا لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں یہی اہتمام مولانا شبلیؒ کے نام کے ساتھ بھی کیا جاتا تو بہتر تھا، تیسرے رسالہ میں اساتذہ و طلبائے مدارس کے لیے مفید اور بیش قیمت ہدایتیں اور نصیحتیں درج ہیں ادھر عربی مدارس جس صورت حال سے دوچار ہیں اسکے پیش نظر اس رسالہ کا مطالعہ خاص طور پر بہت ضروری ہے، ان رسائل کی حیثیت کسی مرتب کتاب جیسی نہیں ہے اسلئے ان میں اصل موضوع سے ہٹ کر بھی بعض باتیں لکھی گئی ہیں تاہم وہ بھی نہایت مفید ہیں یہ تینوں رسالے دینی و اصلاحی حیثیت سے مفید، موثر اور دلپذیر ہیں جو بڑی دلسوزی، دردمندی اور اخلاص و نیک نیتی سے لکھے گئے ہیں ہر مسلمان کو انھیں خود بھی پڑھنا چاہیے، اور ان کی توسیع اشاعت میں بھی حصہ لینا چاہیے۔ "ض"

جلد ۱۳۸ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۶ء عدد ۲

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے کچھ ایسے مایۂ ناز اور قابل فخر فرزند پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی خدمت سے علوم و فنون میں چار چاند لگا کر اس برصغیر کے مسلمانوں کے سروں کو اونچا کیا ہے۔

اس درسگاہ سے ایسے افراد بھی نکلے جنھوں نے اپنی اولوالعزمی اور خوش سلیقگی سے اپنی آیندہ نسلوں کے لیے محنت، عزم اور قوت ارادی کے شاہین کو زیر دام لانے کے مثالی نمونے پیش کیے ہیں، ان ہی میں بھوپال کے مولانا حافظ عمران خان ندوی دام ظلہ الازہری کا نام نامی بھی ہے، ان کی عملی زندگی کا آغاز ندوہ کے مہتمم کی حیثیت سے ہوا، مگر قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کو بھوپال کی تاج المساجد کے لیے بروئے کار لاکر مسلمانوں کی مذہبی سرخروئی اور ملی خودداری کا سرتاج بنا دیں، جب اس کی از سر نو تعمیر کا کام ان کے سپرد کیا گیا تھا تو یہ وہاں کے سابق حکمرانوں اور مسلمانوں کی غفلت شعاری اور پست ہمتی کا ایک سوالیہ نشان تھی، لیکن اس کو مولانائے موصوف نے اپنی ہمت، جد و جہد اور سخت کوشی کا گنبد مینا کر دکھایا، ان کے یقین محکم اور عمل پیہم کی بدولت یہ دہلی کی شاہجہانی اور لاہور کی عالمگیری مسجد کے برابر دکھائی دیتی ہے، شاہجہاں اور عالمگیر کی ان مسجدوں کی تعمیر کے واسطے شاہی خزانے کھلے رہے، مگر مولانا عمران خان ندوی نے اپنی تہی دستی میں جو کشادہ دستی، بے سر و سامانی میں جو میر سامانی، بلکہ اپنی قلندری میں جو شاہنشاہی دکھائی وہ شاہی خزانے سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی، اس مسجد سے ان کو جو عشق ہے اسی کا نور و حضور و سرور شاید ان کے لیے زاد راہ آخرت بنے، جس کی بدولت کیا عجب ان کو بارگاہ ایزدی میں وہی مقبولیت حاصل ہو جو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو ہوتی ہے۔

ان کا دوسرا تازہ شاندار کارنامہ مطالعۂ سلیمانی کی طباعت و اشاعت ہے، معارف کے ناظرین کو یاد ہوگا کہ ستمبر ۱۹۸۵ء میں انھوں نے تاج المساجد کی بزم سلیمانی کی طرف سے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے صد سالہ جشن پیدائش کے سلسلہ میں ایک سمینار منعقد کیا تھا، اس میں جو دھوم دھام اور تزک و احتشام نظر آیا،

وہ ان کی بلند حوصلگی کی روایتی شان کے عین مطابق تھا، اس میں جتنے مقالات پڑھے گئے اور اس موقع پر جو مباحثے ہوئے، ان سب کو بڑے سلیقہ سے ترتیب دے کر ایک کتاب کی صورت میں شایع کیا گیا ہے، ایسی عمدہ کتابت اور طباعت کے ساتھ اردو کی بہت کم کتابیں شایع ہوئی ہوں گی، اس میں بھی وہی خوش ذوقی ہے جو مولانا کی زندگی کے ہر کام میں نظر آتی ہے، اس کے لیے دارالمصنفین ان کے گلے میں مبارکباد کا زریں ہار پہنانے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔

دارالمصنفین اس حیثیت سے شرمسار ہے کہ جو کام اس کی طرف سے ہونا چاہیے تھا، وہ مولانا نے اپنی طرف سے انجام دے کر یہاں کے خدمت گذاروں کو شرمندہ کیا، وہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بہت ہی محبوب شاگرد تھے، اس محبوبیت کا مظاہرہ مطالعۂ سلیمانی ہی کی اشاعت سے کیا جا سکتا تھا، دارالمصنفین کے خدمت گذار ان کے اس کارنامہ کو اپنا ہی کارنامہ تصور کریں تو شاید ان کو اس سے اختلاف نہ ہوگا۔

اس میں مقالات سمیت، ۵۰ تحریریں ہیں جن میں بڑی رنگارنگی ہے، ان کی ترتیب میں یہ عنوانات قائم کیے گئے ہیں: (۱) رہنما خطبات (۲) علوم و فنون سلیمانی پر نظر (۳) فقہیات (۴) تاریخ نگاری (۵) تحقیق و تنقید (۶) لسانیات (۷) تہذیب و تمدن (۸) ادب و شاعری (۹) صحافت (۱۰) طب (۱۱) تصنیفات سلیمانی (۱۲) تعارف و تبصرہ، (۱۳) دیگر نگارشات اردو، عربی (۱۴) ملی سیاسیات و تحریکات (۱۵) سیرت و شخصیت (۱۶) دارالافتاء بھوپال میں (۱۷) بارگاہ سلیمانی میں (۱۸) معاصرین سے روابط؛ ان کے علاوہ مباحثات بزم اور اختتامی تقریر کے بھی علحدہ عنوانات ہیں۔

مذکورہ بالا عنوانات کے ماتحت جو مقالات شایع ہوئے ہیں، ان کے مطالعہ سے حضرت سید صاحبؒ کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے گوناگوں کمالات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، وہ کیا نہ تھے؟ ماہر قرآنیات، قابل قدر فقیہ، وسیع النظر مورخ، دیدہ ور محقق، بلند پایہ نقاد، خوش مذاق زبان دان، اسلامی تہذیب و تمدن کے عاشق زار، شعر و ادب کے بے مثال ادا شناس، علمی و ادبی صحافت کے پیش رو، طب کے رمز شناس، اردو و عربی کے اعلیٰ انشا پرداز، ملی سیاسیات و تحریکات کے بہت بڑے غمگسار اور سلوک و معرفت کے بحر کے شناور، سچ تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت

مستقل ایک تحریک تھی۔

ان کی ہشت بلکہ صد پہل ہیرے جیسی شخصیت اور کمالات کا مطالعہ کرنا آسان نہیں جتنا زیادہ ان کا مطالعہ کیا جائے گا، ان کے نئے نئے پہلو سامنے آئیں گے، جن کو سمیٹ کر لکھنا ایک بڑا مشکل کام ہے، پھر بھی زیر نظر مجموعہ میں حضرت سید صاحبؒ کے بہت سے پہلو سامنے آگئے ہیں، ان پر کوئی کچھ لکھتا ہے تو یہ خاکسار اپنی چشم مجنوں کی وجہ سے اس میں حسن لیلیٰ ہی پاتا ہے، اس مجموعہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سارے کے سارے مقالہ نگار آج کل کے بعض نقادوں اور مقالہ نگاروں کی طرح نرگسیت اور معروضیت کے مرض میں مبتلا نہیں ہیں، ایسے مریضوں کو مولانا عمران خان ندوی نے اپنے یہاں آنے کی زحمت بھی نہیں دی، اور وہ آتے بھی تو شاید ان کی بارعب شخصیت کی موجودگی میں اپنی مریضانہ ذہنیت کا اظہار کرنے کی ہمت بھی نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ حضرت سید صاحبؒ کے گوناگوں کمالات کا ایک خوشنما گلدستہ بن گیا ہے، مگر یہ بات بھی نوک قلم پر بے اختیار آ رہی ہے کہ اس میں شاید مرتب کی لاعلمی اور بے خبری میں ایک آدھ مضمون ایسا بھی شایع ہو گیا ہے جو اس عقیدت نامہ کے عارض گلرنگ کے لیے ایک کیل مہاسہ بن گیا ہے، جہاں کسی کے علم وفن کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار بنانے کی کوشش ہو، وہاں کی مشاطہ گری میں ایسی رخنہ اندازی مناسب نہیں، ہاں جہاں معروضیت کی دیوالی منائی جائے وہاں ایسے ایک دیے کیا، کئی دیوں کی گنجایش نکل سکتی ہے۔

مولانا عمران خان ندوی کے ساتھ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن ندوی اور ڈاکٹر محمد حسان ندوی بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جس تن دہی سے سمینار کو کامیاب بنایا تھا اسی محنت سے ایک دیدہ زیب اور دلفریب مجموعہ کی ترتیب میں ہر قسم کی مدد کر کے ایک بڑا فرض ادا کیا، جس سے اردو زبان کو ایک عمدہ کتاب حاصل ہو گئی۔

مقالات
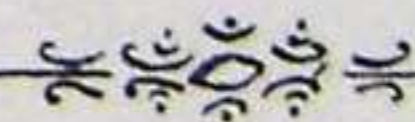
قرآن اور مستشرقین

از، ڈاکٹر التہامی نقرہ صدر شعبۂ قرآن و حدیث کلیۃ الزیتون ٹیونس یونیورسٹی ٹیونس۔

ترجمہ:۔ از عبید اللہ کوٹی ندوی۔ رفیق دار المصنفین،

(۲)

ایک خطرناک بات یہ ہے۔ کہ لیبان نے عربی واسلامی تمدن کے بارے میں منصفانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ اس تمدن پر فریفتہ ہو کر اس کی طرف سے دفاع کرتا ہے، وہ مغربی تمدن پر اس کے اثرات کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ اس کا یہ رویہ قارئین پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ہی جب قرآن ورسول صلی اللہ علیہ وسلم اور شریعت اسلامیہ کے بارے میں اس کے خیالات نظر سے گزرتے ہیں تو اچانک یہ محسوس ہوتا ہے کہ لیبان معروضی انداز تحقیق کو نظر انداز کر چکا ہے۔ اور اب وہ حقیقت سے گریز کر رہا ہے۔[1]

---

[1] وہ عربوں کے تمدن کی تعریف محض اس لئے کرتا ہے کہ اس کو ایک غیر جانب دار مورخ سمجھکر قارئین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کے متعلق اس کی رائے کو صحیح سمجھیں، مستشرقین کا یہ شیوہ رہا ہے کہ جب وہ کچھ زہریلی باتیں کہنا چاہتے ہیں تو وہ بہت کچھ تعریف اور تحسین کی باتیں کہکر اپنی زہریلی باتوں کا جواز نکال لیتے ہیں، لیبان کا بھی یہی موقف رہا ہے لیبان کے دام فریب میں ہمارے بہت سے ارباب علم پھنس گئے ہیں۔ اسی لئے اس کی کتاب کا ترجمہ بڑے آب و تاب کے ساتھ کیا گیا، اور اب بھی اس کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس کی کتاب کے حوالے بھی دیے جاتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم اور کلام پاک کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے اسکے بعد تو مسلمان اس کی کتاب کو چھونا بھی پسند نہ کریں تو بہتر ہے۔ (مترجم)

قرآن مجید اور اس کے اصل سرچشمہ کے بارے میں کچھ مستشرقین کے خیالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقت وحی سے بے خبر ہیں، وحی کا تعلق علم کے اکتسابی طریقوں سے نہیں ہے۔ وہ نفسیاتی الہامات سے بالاتر ہے، نفسیات کے مقررہ اصولوں اور عظیم شخصیتوں کے سوانحی حالات میں اور ایک نبی کے حالات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ نادر شخصیتیں گولڈ زیہر کے بقول کچھ نہ کچھ امراض میں مبتلا ہوتی ہیں۔ اور رینان کے خیال میں دنیا کی عظیم قوموں کے رہنما، جذب اور وارفتگی کے مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن وحی کو اس طرح کسی جذب یا نفسیاتی مرض کا نتیجہ سمجھنا، خود مستشرقین کی اپنی نادانفیت کی دلیل ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقوال سے ہوگا۔

ویلز (G. Wells) کا یہ خیال ہے کہ مقدس مذہبی افراد کی صف میں شامل ہونے کی خواہش سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دور کہولت میں ان کے احساسات اور حوصلہ مندانہ جذبات نے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک نئے دین کی بنیاد رکھیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا مجموعہ تیار کیا جس میں خرافاتی عقائد اور سطحی روایات و رسوم درج ہیں، انھوں نے اپنی قوم میں اس مجموعہ کی اشاعت کی اور کچھ لوگوں نے ان کی پیروی بھی کی۔[1]

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مذہبی معلومات حاصل ہوئیں ان کا ماخذ گولڈ زیہر کے لفظوں میں دو عنصر تھے، خارجی اور داخلی، وہ لکھتا ہے کہ

"نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیام در اصل ان مذہبی خیالات اور دینی معلومات کا خلاصہ تھا۔ جو آپ کو یہودی اور عیسائی حلقوں سے روابط کی وجہ سے حاصل ہوئے ان خیالات سے بہت زیادہ متاثر ہونے کے بعد آپؐ کو یہ یقین ہو گیا۔ کہ اپنے ہم وطنوں میں ان کے ذریعہ سچے مذہبی جذبات کو بیدار کیا جا سکتا ہے، بیرونی عناصر سے حاصل

---

[1] الاسلام والثقافة العربية فی مواجهة الاستعمار۔ ص ۲۳۹ (ط الرسالہ۔ مصر)

کی ہوئی یہ تعلیمات آپ کے ذوق و وجدان میں پیوست ہو گئیں۔ آپ کا یہ خیال تھا۔ کہ ان کی مدد سے رضائے الٰہی کے حصول کی راہ میں، آپ زندگی کو ایک نیا رنگ دینے میں کامیاب ہو جائیں گے"۔

یہ خیالات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گئے۔ بیرونی اثرات نے ان پر اس قدر اثر ڈالا، کہ یہی خیالات ان کا عقیدہ بن گئے۔ لیکن وہ ان کو وحی الٰہی بھی سمجھتے رہے۔[1] بلاشیر، اپنی تحقیقات میں معتدل نظر آتا ہے۔ مگر وہ قرآن کے اصل سرچشمہ پر بحث کرتے ہوئے خاص طور پر اس نکتہ پر زور دیتا ہے کہ "قرآن کے بیان کردہ واقعات اور یہودی اور عیسائی قصص و حکایات کے درمیان مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ مشابہت مستشرقین کی توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔ اس کے نزدیک، ابتدائی مکی سورتوں میں مسیحی اثرات بہت واضح ہیں۔ اور انجیل کے غیر تسلیم شدہ نسخوں خصوصاً کتاب پیدائش میں جو اس زمانہ میں عام تھی اور قرآنی قصص میں مشابہت موجود تھی۔ اس بحث کے سلسلہ میں بلاشیر کچھ محققین کے خیالات پیش کرنے کے بعد، یہ ثابت کرتا ہے کہ "بانی اسلامؐ اور مسیحی راہبوں کے درمیان رابطہ کی وجہ سے دونوں میں باہم تعلقات استوار ہوئے۔ اور یہ تعلقات مسلسل برقرار رہے۔[2]

ایک اور کتاب تاریخ الادیان (Manuel de l'histoiredesreligions) درج ذیل خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ

"دعوت اسلام کے ابتدائی عہد میں، قرآن میں نبی کا اسلوب جذباتی ہے۔ مختصر جملوں اور شاندار اسلوب میں وہ نمایاں طور پر رنگ آمیزی کر کے۔ جزا و سزا کی

---

[1] گولڈزیہر۔ العقیدة والشریعة فی الاسلام (ترجمہ۔ یوسف موسیٰ وغیرہ) ص ۱۲۔ ط مصر ۱۹۴۶ء

[2] Le Probleme du Mahomet: 60 (P.U.F. Peris 1952

کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ آیات کی تکرار سے اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ کہیں کہیں
تو اس تکرار سے برعکس مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد، نبیؐ کا یہ
ابتدائی اسلوب بدل گیا۔ اب وہ نبیوں کے واقعات کو عجیب پرسکون آہنگ میں پیش
کرنے لگے۔ چنانچہ یوسفؑ اور ان کی بیوی (پوتیفار) کی داستان محبت کو انھوں نے
اسی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اسلوب ایران اور ترک کے بہت سے شعراء کے لئے
خیال انگیز ثابت ہوا۔ لیکن آخری دور میں ان کے اسلوب نے اپنی حرارت اور فن
کو گم کر دیا۔ اب نبیؐ، یہود و نصاریٰ سے بحث و نظر پر فریفتہ دکھائی دیتے ہیں۔[1]

بہرحال مستشرقین کی اکثریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی اور قرآن کے
سرچشمہ کے بارے میں صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں ناکام رہی ہے۔ مغربی مصنفین نے کسی دلیل و ثبوت
کے بغیر اپنے ہی نقطۂ نظر کی تکرار جاری رکھی۔ ان میں عصبیت کے زخم خوردہ محققین جب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن یا اسلام کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ تو ان کے قلم و زبان میں
کدال اور پھاوڑہ کی جیسی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فلپ ایرنجی نے پیرس کے ایک مجلہ[2] میں
ایک مضمون لکھا۔ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کردار کشی کی غرض سے ایسی بات لکھی ہے۔
جس سے کوئی بھی شریف محقق اپنا دامن داغدار کرنا پسند نہ کرے گا۔ اس نے اپنے مقالہ میں یہ دعویٰ
کیا ہے کہ محمدؐ مکہ میں یہود سے اکثر ملاقاتیں کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ مؤلف کے نقطۂ نظر کی تردید اس
بات سے ہو جاتی ہے کہ یہودی بود و باش مدینہ میں تھی، مکہ میں نہ تھی، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "محمدؐ" اپنے خادم
زید سے جو عیسائیوں کے غلام رہ چکے تھے، یہودی اور مسیحی مذاہب کے بارے میں استفادہ کی غرض سے

[1] عن القرآن۔ محمد صبیح۔ ص ۱۴۰، ۱۴۴۔ ط مصر ۱۹۳۹ء۔
[2] المجلة الآسيوية ۱۹۰۴ء۔

سوالات کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے خادم سے زیادہ فہیم تھے"۔ اس کے بعد مؤلف لکھتا ہے کہ
"محمدؐ، مدینہ میں یہودیوں کے شاگرد تھے۔ یہود نے ہی شخصیت تیار کی تھی انھوں
نے جو داستانیں یہود و نصاریٰ سے سنیں، جبرئیل نے ان میں ہی اضافہ و تکمیل کا کام
انجام دیا۔

مذکورہ بالا اقتباس میں مؤلف نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عجیب متضاد بات
لکھی ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے مستفید ہوئے۔ اور جبرئیل بھی ان کے پاس آتے رہے۔ یہود و نصاریٰ
سے استفادہ کے لئے مؤلف کے پاس کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ وہ اس بارے میں کوئی عقلی دلیل
بھی پیش نہیں کر سکا۔ پھر یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبرئیل آیا کرتے تھے۔

مستشرقین اور مغربی دانشوروں کی طرف سے مذکورہ بالا خیالات کا مطالعہ کرنے کے بعد
یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن و حدیث دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔ تو پھر ان دونوں کے
اسلوب بیان، طرز ادا اور طریق تعبیر میں نمایاں فرق کیوں ہے۔ کسی بھی ایک شخص کے لئے خواہ
وہ کتنا ہی بڑا فن کار ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایک خاص اسلوب میں گفتگو کرنے کے بعد اسے خدا کی
طرف سے نازل کردہ کلام قرار دے پھر اس کے بعد، اس سے بالکل ہی مختلف دوسرا اسلوب
اختیار کرتا رہے۔ اور اسے اپنا کلام قرار دے۔

کیا دو طرح کا کلام جس کا اسلوب اور انداز ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہو۔
ایک ہی شخص کے بس میں ہے؟ کیا یہ بات قطعی نہیں کہ کلام کا اسلوب و انداز، اپنے متکلم کی شخصیت
کا پتہ دیتا ہے۔؟

قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف و ترتیب کا نتیجہ ہوتا تو اسے اپنی طرف منسوب
کر لینے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

مستشرقین کی طرف سے، ایک اور نادر خیال بھی پیش کیا گیا ہے۔ کلیمان ہُوَرْ (Huart) نے اپنے ایک مقالہ میں، قرآن کے ایک نئے سرچشمہ کی دریافت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ قرآن مجید، امیہ بن ابی الصلت کے اشعار سے ماخوذ ہے۔ اس نے امیہ بن ابی الصلت[1] کے اشعار اور قرآنی آیات کے درمیان موازنہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ امیہ بن ابی الصلت کی طرف ان اشعار کی نسبت نسبت درست ہے۔ کیونکہ ان اشعار میں ثمود وصالح وغیرہ کے واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور قرآن میں ان ہی واقعات کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے۔ کہ یہ اشعار اگر زمانہ مابعد کے تسلیم کئے جائیں تو یہ ضروری ہوگا کہ ان میں، اور قرآن کے بیان کردہ واقعات میں کامل طور پر یکسانیت پائی جائے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ نظم قرآن میں، امیہ کے اشعار سے استفادہ کیا گیا تھا۔ اور اسی لئے امیہ بن ابی الصلت سے مقابلہ آرائی کی اور اس کے شعری نمونوں کو باقی نہیں رہنے دیا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ قرآن کا نیاپن برقرار رہے۔ اور ان کے اس دعویٰ پر کوئی حرف نہ آئے کہ یہ قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانی وحی کے ذریعہ حاصل ہوا ہے۔

مصر کے مشہور فاضل ادیب طٰہٰ حسین نے مذکورہ بالا غلط بیانی کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ان بحثوں میں مستشرقین کا یہ طرز عمل حیرت انگیز ہے، کہ وہ روایات سیرت کو مشکوک قرار دیتے ہیں، ان میں سے بعض نے تو ان روایات کی صحت ہی کا سرے سے انکار کر دیا ہے، وہ ان روایات کو تاریخ کا ایک مستند ماخذ تسلیم نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک

[1] دور جاہلیت اور عہد اسلام کا شاعر ہے۔ ایک نبی کی بعثت کی خبر دیا کرتا تھا۔ اور اپنے ہی بارے میں اسکو نبی ہونے کی توقع تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی تو اس نے حسد کی وجہ سے آپ کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کردیا، (بت پرستی سے بیزار تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے اشعار سنے تو فرمایا کہ اس کی زبان مومن ہو لیکن دل کافر ہے، وہ اپنے اشعار میں انبیاء کے واقعات بیان کیا کرتا تھا۔ (دیکھئے اشعر والشعراء - ابن قتیبہ ص ۴۲۹ ط مصر ۱۳۶۴ھ)

گروہ کا نقطۂ نظر خالص علمی اور تحقیقی ہے۔ وہ سنت نبوی کو احادیث واخبار کا ایسا مجموعہ قرار دیتا ہے جس میں وضعی روایات موجود ہیں اور بحث وتحقیق کے بعد ان میں سے صحیح واقعات کو الگ کرنے کی ضرورت ہے۔ روایات کے بارے میں یہ تمام مستشرقین اپنے ایک ہی موقف پر سختی کے ساتھ قائم ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ امیہ بن ابی الصلت اور اس کے شعری سرمایہ پر اپنے اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ حالانکہ سیرت کے مقابلہ میں امیہ کے اشعار، اپنی سند اور راویوں کی صدق ودیانت کے اعتبار سے کچھ زیادہ معتبر نہیں، ان روایات پر مستشرقین کے اعتماد واعتبار کا راز کیا ہے؟ اس کی یہ وجہ تو نہیں ہے کہ وہ بعرے مذاہب کے محققین پر وہ جس تعصب کا الزام رکھتے ہیں۔ اس میں وہ خود ہی گرفتار ہوں[1]

ہم اس بحث کی مزید وضاحت کے لیے قرآن مجید کی چند آیتیں درج کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ امیہ کے کچھ اشعار بھی درج کریں گے (حالانکہ امیہ کی طرف ان اشعار کی نسبت مشکوک ہے

فتولّ عنهم يوم يدع الداع	تو آپ ان کی طرف سے کچھ خیال نہ کیجئے
الى شئ نكر خشعا ابصارهم	جس روز ایک بُلانے والا فرشتہ (ان کو)
يخرجون من الاجداث كأنهم	ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا۔ ان کی
جراد منتشر (قمر ۶-۷)	آنکھیں (ذلت کی وجہ سے) جھکی ہوں گی
	اور قبروں سے اس طرح نکل رہے ہوں گے
	جس طرح ٹڈی (چاروں طرف) پھیل جاتی ہے)
إنا جعلنا ما على الارض زينة	ہم نے زمین پر کی چیزوں کو اس زمین کے لئے
لها لنبلوهم ايهم احسن عملا	باعث رونق بنایا تاکہ ہم ان لوگوں کی

[1] الادب الجاہلی - طٰہٰ حسین - ص ۱۳۳ - ط قاہرہ ۱۹۵۸ء

وانا لجاعلون ما علیها صعیداً جرزاً (کہف - ۸، ۷) — آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے اور ہم اس (زمین) پر کی چیزوں کو ایک صاف میدان (یعنی فنا) کر دیں گے۔

کلما ألقی فیها فوج سألهم خزنتها الم یاتکم نذیر قالوا بلی .... (ملک ۸، ۹) — (۱) جب (دوزخ) میں کوئی گروہ (کافروں کا) ڈالا جائے گا، تو اس کے محافظان لوگوں سے پوچھیں گے کہ کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) نہیں آیا۔

امیہ بن ابی الصلت کے اشعار یہ ہیں۔[۱]

ویوم موعدهم ان یحشروا زمرا	یوم التغابن اذ لا ینفع الحذر
مستوسقین مع الداعی کأنهم	رجل الجراد زفته الریح منتشر
وأبرزوا بصعید مستوجر	وانزل العرش والمیزان والزبر
یقول خزانها ما کان عندکم؟	ألم یکن جاء کم من ربکم نذر
قالوا بلی فتبعنا فتیة بطروا	وغرنا طول هذا العیش والعمر

(ترجمہ) (۱) قیامت کے دن جب لوگ گروہ در گروہ جمع کئے جائیں گے تو وہ سود و زیاں میں کمی بیشی کا دن ہوگا۔ اس روز بچ نکلنے کی ساری کوششیں عبث ہو جائیں گی۔

(۲) وہ پکارنے والے کی آواز پر اس طرح اکٹھے ہو جائیں گے جیسے کہ ٹڈیوں کا دل ہو، اور تیز ہوا نے ان کو منتشر کر دیا ہو۔

(۳) ان کو چٹیل میدان میں لایا جائے گا جہاں عدالتِ انصاف میزانِ عمل اور آسمانی کتب موجود ہونگی۔

---

[۱] المجانی الحدیثۃ ۔ البستانی ۔ ج ۱ ص ۲۶۷ بیروت ۱۹۴۶ء۔

۴۔ داروغۂ جہنم سوال کریں گے کہ تمھارے پاس عمل کی پونجی کیا ہے؟ کیا تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس کوئی آگاہی دینے والا نہیں آیا۔؟

۵۔ وہ جواب دیں گے کہ آگاہی دینے والے آئے لیکن ہم نے متکبر جوانوں کا ساتھ دیا ہم کو زندگی اور عیش کی فراوانی نے دھوکہ میں ڈال دیا تھا۔

ان اشعار کو اس حریفانہ طرزِ عمل سے کوئی مناسبت نہیں جو امیہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختیار کر رکھا تھا، وہ آپ کے رفقاء کی ہجو اور آپ کے مخالفین کی حمایت میں پیش پیش تھا۔ غزوۂ بدر میں جو مشرک قتل کئے گئے، ان کے غم میں اس نے مرثیے لکھے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے خیالات اخذ کئے ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کیا ہو؟ پھر اگر قرآن مجید کے جواب میں یہ اشعار کہے گئے ہوتے تو ان میں اور قرآنی نصوص میں یکساں تعبیرات نہ ہوتیں، شاعر تو اس بات کی کوشش کرتا ہو کہ اس کے اشعار کو تکلف اور تصنع سے پاک سمجھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورۂ بالا اشعار کی امیہ کی طرف نسبت کو درست نہیں سمجھا گیا ہے۔ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اس کے اصل کردار کی جھلک بھی موجود نہیں ہے۔ ان اشعار کا مصنوعی انداز بیان، امیہ کے معیار و مقصد کے مطابق بھی نہیں ہے۔

ایک اور مستشرق سی ٹسڈل (C.Tisdal) ناقدین قرآن کے شبہات بیان کرنے کے بعد، قرآن کے ربانی سرچشمہ پر نقد کرتا ہے۔ اس نے امرء القیس کی طرف منسوب درج ذیل اشعار نقل کئے ہیں۔ ان میں قرآنی تعبیرات موجود ہیں۔

دنت الساعة وانشق القمر	عن غزال صاد قلبی ونفر
احور قد حرت فی اوصافه	ناعس الطرف بعینیه حور

بسهام من لحاظ فاتك   تركتني كهشيم المحتضر

۱۔ قیامت قریب آگئی، اور چاند پھٹ گیا لیکن مجھے ہرنی صفت محبوبہ سے بچھڑنے کا احساس ہے جس نے میرے دل کا شکار کیا، اور چلی گئی۔

۲۔ وہ بڑی اور روشن آنکھوں والی ہے، اس کی خوبیاں دیکھ کر میں متحیر ہو گیا ہوں، اس کی آنکھیں نشیلی ہیں، شفاف اور سپید حلقہ میں سیاہ پتلی حسن میں اضافہ کر رہی ہے۔

۳۔ اس کے قاتل نگاہوں کے تیر نے مجھے ایک لاغر قیدی بنا دیا ہے۔

عربی زبان و ادب کا ایک ماہر ادیب اور مبصر عباس محمود عقاد لکھتا ہے۔ کہ قبل اسلام کی عربی زبان، اور قرآن کی زبان میں یکسانیت ثابت کرنے کے لئے الل ٹپ بحث کرنے والے یہ مستشرقین اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ علمائے اسلام مذکورہ بالا اشعار کی دور جاہلیت سے نسبت کا انکار کرتے ہیں۔ عاجز اور بے بس نظر آتے ہیں۔ ان مستشرقین کا ذوق ادب شناس نہیں ہے۔ کیونکہ ان اشعار پر پہلی نظر پڑتے ہی یہ یقین ہو جاتا ہے کہ امراء القیس یا کسی بھی جاہلی شاعر کی طرف ان کو منسوب کرنا ایک غیر ادبی حرکت ہے[1]۔

قرآن مجید فصیح و بلیغ عربی زبان کا بلند ترین نمونہ ہے۔ اس لیے اس دور میں نثر و نظم میں جو عربی تعبیرات موجود تھیں، اور مخاطب سے گفتگو اور افہام و تفہیم کیلئے جو محاورے مانوس تھے، قرآن نے ان کو بھی استعمال کیا ہے۔ حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام نے بعض مسائل پر اظہار خیال کیا تو قرآن نے اپنی ہدایت اور رہنمائی کے ضمن میں ان کے لفظوں کو بھی نقل کیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن کو ان سے ماخوذ قرار دیدیا جائے۔ اور پھر امیہ کے قول دنت الساعة۔ اور قرآنی الفاظ اقتربت الساعة میں ادبی نقطۂ نظر سے بڑا فرق ہے[2]۔

---

[1] اسلامیات، از عباس محمود العقاد۔ ص ۵۱، ۵۲۔ طا مصر دار الشعب۔ [2] قرآنی لفظ "اقتربت" کا صوتی آہنگ قیامت کی ہولناکی کو زیادہ واضح کر دیتا ہے، اس کے علاوہ معنوی اعتبار سے بھی اقتربت کا لفظ زیادہ جامع ہے۔ (مترجم)

دور جدید کے سائنسی انکشافات اور علمی تحقیقات نے قرآنی بیانات کی تصدیق کی ہے۔ کائنات کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر اور انسانوں کے لیے اس کی ہدایات اور رہنمائی کی صحت پر اب تو نئے سائنسی دلائل بھی میسر آگئے ہیں، قرآن جس کثرت کے ساتھ علمی حقائق سے بحث کرتا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال، کتب آسمانی میں موجود نہیں، قرآن کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر وہ اس زمانہ میں نازل ہوتا تب بھی دور جدید کی علمی ترقیوں کے درمیان اس کے بیانات اپنی جگہ ثابت شدہ اور اٹل رہتے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ذاتی صلاحیتوں ہی کا نتیجہ ہو؟ کیا گردو پیش کے یہود و نصاریٰ یا بدو عربوں سے استفادہ کر کے ایسا قرآن پیش کرنا ممکن تھا۔؟

انسانی تاریخ میں کیا کسی ایسے امی کی مثال موجود ہے۔ جو جوانی کی سرحدوں کو پار کر گیا ہو اور علم اور دانشوری کی کوئی بات اس میں نہ پائی جاتی ہو[1]۔ اس نے اس عرصہ میں نہ تو شاعری اور خطابت کے جوہر دکھائے ہوں، اور نہ ہی تاریخی ہیروں اور بڑے رہنماؤں کی طرح اس میں ترقی اور بلندی کی طرف جست لگانے والا حوصلہ پایا گیا ہو، پھر وہی امی چالیس برس مکمل کرتے ہی اچانک ایک نئے دور کے بانی کی حیثیت سے نمودار ہو۔ انسانوں کے مذہبی عقائد و روایات اور مذہبی قوانین کی اصلاح کرے، ایسا اجتماعی و روحانی انقلاب برپا کر دے جس کی پوری انسانی تاریخ میں کوئی نظیر نہ ہو، ایسی عمر میں کسی امی کی طرف سے اچانک کسی کام کا آغاز کرنا، کسی علم و فن کی بنیاد ڈالنا، یا نئے قوانین وضع کرنا۔ اور عمومی انقلاب لے آنا ممکن نہیں۔ ایسے کارنامے انجام دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سابق میں اس کے لیے تیاریاں مکمل کر لی گئی ہوں، اور عنفوان شباب میں اس کے لئے

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دانشوری قبل اسلام بھی زبان زد تھی۔ تعمیر کعبہ کے موقع پر حجر اسود کے نزاعی مسئلہ کو آپ ہی نے اپنی دانشمندی سے حل کیا تھا۔ (مولف)

لازمی شرائط و اوصاف حاصل کر لیے گئے ہوں ۔[1] لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت سے پہلے امی ہی تھے ۔ انھوں نے جو انقلاب برپا کیا ۔ اس کے لیے ان کی پچھلی زندگی میں ، تعلیم و تربیت اور حصول استعداد کے وہ مواقع نہیں تھے ۔ جن کی بنا پر آئندہ زندگی میں ان سے کسی بڑے کام کی توقع کی جاتی ۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے قبل اور بعد کی زندگی میں جو نمایاں فرق نظر آتا ہے ۔ وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کسی نبی تعلیم کا نتیجہ ہے ۔ انسانی نفسیات پر اثر انداز ہونے کی وہ حیرت انگیز صلاحیت ، جو بعد میں آپ کے اندر پیدا ہو گئی تھی ۔ وہ یقیناً اس وحی کا پرتو ہے ۔ جو آپ پر اثر انداز ہو چکی تھی ۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے کہ :۔

وانزل اللہ علیک	اور اللہ تعالےٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں
الکتاب والحکمۃ	نازل فرمائیں اور آپ کو وہ وہ باتیں بتلائی
۔ ۔ ۔ وعلمک مالم	ہیں ، جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ
تکن تعلم وکان فضل اللہ	کا بڑا فضل ہے ۔
علیک عظیما ۔ (نساء ۔ ۱۱۳)	

وحی قرآنی کا سرچشمہ ذات محمدیؐ سے باہر تھا ۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے نبی کی ذاتی رائے اور شخصی مزاج سے کئی جگہ اختلاف کیا ہے ۔ مثلاً ایک موقع پر نبی پر عتاب کرتے ہوئے یہ تاکید کی گئی ہے کہ

ماکان لنبی ان یکون لہ أسریٰ	نبی (کی شان) کے لائق نہیں کہ ان کے
حتی یثخن فی الأرض	قیدی (باقی) رہیں (بلکہ قتل کر دیئے جائیں)

[1] الوحی المحمدی ۔ رشید رضا ۔ ص ۳۰۲

تریدون عرض الدنیا	جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح
واللہ یرید الآخرۃ واللہ	(مقابلہ پر آنے والے ان کفار کی) خون
عزیز حکیم ، لولا کتاب	ریزی نہ کرلیں ۔ تم تو دنیا کا مال و اسباب
من اللہ سبق لمسکم فیما	چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت)
أخذتم عذاب عظیم ،	کو چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست
(انفال ۲۷ ۔ ۲۸)	حکمت والے ہیں) اگر اللہ تعالیٰ کا ایک نوشتہ
	(مقدر) نہ ہو چکتا تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے ۔
	اسکے بارہ میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی ۔

بدر کے قیدیوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نرم خوئی کی وجہ سے فدیہ لیکر چھوڑ دیا تھا آپ کو یہ توقع تھی کہ اس بات کا حریف طاقتوں پر اچھا اثر پڑے گا ۔ اور آپ کی قوم بھی شاید ہدایت پا جائے ۔ لیکن آپ کو دوسرا طرز عمل اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ۔ اور یہ بتایا گیا ، کہ اس موقع پر حکمت الٰہی کے مطابق کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے تھا ۔ اس عتاب میں مقام ربوبیت اور مقام عبدیت کا فرق بہت زیادہ نمایاں ہے ۔ طرز کلام ایسا ہے کہ متکلم اور مخاطب دونوں کی حیثیت واضح طور پر مختلف نظر آتی ہے ۔

غزوہ تبوک میں شرکت سے باز رہنے پر جب منافقین نے آپ کے سامنے اپنے اپنے عذر پیش کیے تو ان کو آپ نے شریک نہ ہونے کی اجازت دیدی ، اس پر یہ عتاب نازل ہوا ۔

عفا اللہ عنک لم اذنت لھم	اللہ تعالےٰ نے آپ کو معاف (تو) کر دیا لیکن
حتی یتبین لک الذین صدقوا	آپ نے ان کو (ایسی جلدی) اجازت کیوں
وتعلم الکاذبین (توبہ ۔ ۴۳)	دیدی تھی ، جب تک کہ آپ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہو جاتے اور آپ جھوٹوں کو معلوم نہ کر لیتے ۔

مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گردوپیش کے ان یہودیوں اور عیسائیوں سے معلومات اخذ کی تھیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد آپ کے صحابی و رفیق بنے۔ یہ محض ایک ذہنی خیال ہے۔ ان کا ایمان لے آنا تو اس بات کا ایک قطعی ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی ایک اٹل صداقت تھی، ان کو جو پیغام حق سنایا گیا تھا۔ وہ اگر انہی سے استفادہ کرکے ترتیب دیا گیا ہوتا تو وہ لوگ آپ کو چھوڑ کر اپنے اپنے دین کی طرف واپس لوٹ جاتے، وہ رسول کی عقیدت و محبت میں مخلص نہ ہوتے، اور نہ ہی اسلام کے لئے اپنی دعوتی خدمات میں وہ اس قدر جانفشانی کرتے، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تکلیفوں پر پیہم صبر و تحمل، سرکشی اور عناد پر مسلسل ضبط اور برداشت کا رویہ، تاریخی شہادتوں کی بنا پر اس بات کا صحیح قرینہ ہے کہ آپ کی نبوت برحق تھی۔ اور آپ کا پیغام ایک ابدی صداقت تھا۔ اس پر آپ کو کامل یقین تھا۔ اور مختلف مذاہب کے جو لوگ آپ پر ایمان لائے وہ بھی پیغام اور پیغمبر دونوں کی صداقت کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

انسانی تاریخ میں جھوٹی نبوت کے دعویدار شعبدہ باز مفکرین اور دجل و فریب میں مبتلا قائدین اپنی تحریکوں اور دعوتوں کے لیے اس قدر قربانیاں پیش نہیں کرتے۔ اور ان کے پیروؤں میں ایسا ہی ایمان و اخلاص، اور حکموں کی ایسی ہی بجاآوری نظر نہیں آتی ہے۔ اس کا نمونہ تو ہم کو سیرت نبوی میں یا صحابۂ کرام ہی کے حالات میں نظر آتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زبردست نبوی کردار اور اس کے حیرت انگیز نتائج کے بعد بھی اگر کسی کو دلیل نبوت کی جستجو ہو تو یہ ایسا ہی ہوگا۔ جیسا کہ کسی عظیم معمار اور ماہر انجینیر نے بڑی عظیم اور پرشکوہ عمارتیں تعمیر کی ہوں اور ان کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی کوئی شخص فن تعمیر سے ان کی واقفیت کا ثبوت طلب کرے۔

سویڈن کے ایک مستشرق ٹار انڈریک (Tar Andrae) نے اپنی کتاب "محمدؐ، ان کی زندگی اور عقائد" میں، یہ لکھا ہے کہ اس موضوع پر مستشرقین کی بحث و نظر کا طریقہ مفید نہیں ہے۔ اس نے یہ صراحت کی ہے کہ

"نبوت کو ہزاروں جزئی عناصر کا مجموعہ قرار دیکر پھر اس کے جوہر کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ایک محقق کا فرض تو یہ ہے کہ وہ ایک ماہر مبصر کی طرح یہ دیکھے کہ مختلف عناصر اور محرکات سے وہ جوہری وحدت کس طرح وجود میں آگئی جس میں زندگی کے تمام علامتیں پائی جاتی ہیں۔ اسلام اس بات کا منکر نہیں ہے کہ یہودی، مسیحی اور حنیفی (ابراہیمی)، مذاہب اور عربی روایات سے اس کے روابط نہیں ہیں، لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ وہ محض مذکورہ بالا عناصر ہی کا مجموعہ ہو۔"[۱]

قرآن مجید میں جو غیبی خبریں اور علمی حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ ان سے عیاں ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن کسی انسانی عقل و فہم کا نتیجہ نہیں ہے۔ چنانچہ جن مسلم یا غیر مسلم محققین نے قرآن کے بیان کئے ہوئے علمی اور کائناتی حقائق کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے۔

فرانس کے ایک محقق ڈاکٹر موریس بوکائی نے اپنی کتاب "قرآن، بائبل اور سائنس" میں اپنے مطالعہ کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"قرآن نے جن سائنسی گوشوں پر بحث کی ہے وہ میرے لیے خاص طور پر حیرت انگیز ہے۔ یہ بحثیں پوری طرح جدید سائنسی علوم کے مطابق ہیں۔ میں نے پہلے سے کوئی فیصلہ کئے بغیر، بڑی بیدار مغزی کے ساتھ، معروضی انداز میں قرآنی بیانات کا مطالعہ کیا تھا۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے غیر شعوری طور پر، اس مطالعہ میں ان معلومات۔

---

[۱] مجلۃ مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق۔ محمد کامل عیاد۔ ج ۳ م ۴۴ / ۱۹۶۹ ص ۱۰۰،

کا بھی اثر قبول کیا ہو، جو مجھے جوانی کی عمر میں حاصل ہوئی تھیں، اس زمانہ میں، اکثر لوگوں کی طرح سے اسلام کے بجائے محمدیوں کے بارے میں باتیں ہوا کرتیں، صرف یہ بتانے کے لیے کہ اس مذہب کا بانی ایک انسان ہے، یہ آسمانی مذہب نہیں ہے۔ اس لیے اللہ کے یہاں بھی اس مذہب کی کوئی وقعت نہیں ہے، یہ ممکن تھا۔ کہ میں اسلام کے بارے میں پھیلے ہوئے ان غلط خیالات میں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اب بھی الجھا رہتا۔

"میں نے چند روشن خیال لوگوں سے ملاقات کی، وہ قرآن کے ماہر نہ تھے، تاہم ان سے گفتگو کے بعد۔ اسلام کے بارے میں میرے ذہن میں جو تصویر ابھری وہ مغربی ذرائع سے حاصل ہونے والے خیالات سے بالکل ہی مختلف تھی۔ میں نے قرآن کے مطالعہ کو اپنا نصب العین بنایا، تنقیدی مطالعہ کی غرض سے مختلف اہم حواشی کی مدد سے قرآن کی ایک ایک آیت کا جائزہ لیا، یہ حقیقت میرے لیے چونکا دینے والی تھی۔ کہ قرآن نے کائناتی مظاہر کے بارے میں خاص طور پر دقیق اشارے کیے ہیں۔ اور وہ ان تصورات وافکار کی تائید میں ہیں، جو کائنات کے بارے میں اس وقت تک ہمیں دریافت ہوئے ہیں محمدؐ کے زمانہ میں کسی بھی انسان کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ کائناتی مظاہر کے بارے میں ہمارے دریافت کردہ نظریات وحقائق کا ایک ادنیٰ تصور بھی قائم کر لیتا۔ اس کے بعد میں نے بہت سی ایسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جو مسلمان اہل علم نے خاص طور پر، قرآن کے سائنسی پہلوؤں پر لکھی ہیں۔ توراۃ میں ہم کو نمایاں طور پر سائنسی اغلاط ملتی ہیں۔ لیکن قرآن میں اس طرح کی کوئی ایک غلطی بھی، دستیاب نہیں ہوتی، اس صورت حال نے میرے سامنے ایک اہم سوال پیدا کر دیا۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن کا مؤلف اگر کوئی انسان ہوتا تو ساتویں صدی عیسوی میں وہ ایسی باتیں کیسے لکھ سکتا تھا۔ جو دورِ جدید کی تحقیقات

کی روشنی میں بھی بالکل درست ثابت ہوں۔ قرآن کا جو نسخہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ وہی نسخہ یقینی طور پر ابتداء ہی سے اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ نزول قرآن کے زمانہ میں کوئی بھی انسان جس کا علمی افق، ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی ہماری علمی سطح سے زیادہ وسیع اور جدید تر ہو، ایسا ممکن نہیں، واقعہ یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر قرآنی اشارات حیرت انگیز حد تک سائنسی پہلو رکھتے ہیں، جس کو پڑھ کر ہم چونک جاتے ہیں۔

سائنس نے جن مسائل پر غور وفکر کیا ہے۔ ان میں سے قبل ولادت، بچہ کی نشو ونما کے مختلف مراحل کا مسئلہ بھی ہے۔ بطن مادر میں بچہ کی نشو ونما کے جو مراحل قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کا علم الجنین کے سائنسی انکشاف سے موازنہ کر کے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنی آیات اور جدید تحقیقات کس حد تک اپنے نتائج میں یکساں ہیں[1]۔

ڈاکٹر بوکائی کی مذکورہ بالا شہادت بڑا وزن رکھتی ہے، وہ ایک محقق عالم اور نکتہ رس اسکالر ہے۔ اس نے قرآن کی ایک ایک آیت کا بغور مطالعہ کیا ہے، ایک ماہر اور مبصر عالم کی حیثیت سے سائنسی علوم کی روشنی میں اس نے اپنی تحقیق کے جو نتائج اہل علم کے سامنے پیش کیے ہیں۔ اس سے علم کی شان دوبالا ہو جاتی ہے، اس نے دوسرے مستشرقین کی طرح یہ رائے نہیں دی کہ قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کی معلومات پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیب دیا ہو۔

بوکائی کے تحقیقی نتائج کے بالکل ہی برعکس، ایک اور مستشرق الحداد[2]، قرآن مجید پر اپنے تحریر کردہ حواشی میں دوسری رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بند لفافہ کو کھولے اور پڑھے بغیر ہی اظہار خیال کی جرأت کر رہا ہے، وہ لکھتا ہے۔ کہ

---

[1] موریس بوکائی۔ القرآن والتوراۃ والعلم۔ ص ۱۸۰-۲۴۴، ط دار المعارف مصر ۱۹۷۷ء۔

[2] الحداد نے "دراسات قرآنیہ" کے سلسلہ کی کئی کتابیں لکھی ہیں، جن پر اس کا نام "الاستاذ الحداد" درج ہے، اس کے حواشی قرآن پر تاریخ اشاعت اور پریس کا نام بھی موجود نہیں ہے، غالباً وہی یوسف الحداد ہے جو ایک لبنانی عیسائی ہے۔ (مولف)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابی تعلیم اور انجیل سے واقفیت کا راز یہ ہے کہ ان کے پڑوس میں خدیجہؓ کے چچازاد بھائی جو بنو اسد قبیلہ سے تھے، موجود تھے۔ وہ ایک مسیحی عالم تھے۔ انھوں نے ہی اپنے چچا کی بیٹی خدیجہ کا آپ سے نکاح کیا۔ تاریخی واقعات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ورقہ نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ وہ تورات وانجیل کا عربی زبان میں ترجمہ کرتے تھے۔ اس لیے وہ یقیناً ایک بڑے عیسائی عالم تھے، نبوت سے پہلے محمدؐ ان کے پڑوس میں پندرہ برس رہے، کیا عرب کے نابغہ محمدؐ بن عبد اللہ کے لئے یہ مدت، توراۃ وانجیل کا علم حاصل کرنے کے لئے کافی نہ تھی۔؟

صحیح بخاری میں یہ صراحت بھی ہے کہ محمدؐ، غار حرا سے، جب خائف ہوکر لوٹے تو ورقہ نے ہی ان کی دعوت اور نبوت کی تصدیق کی۔ مگر ورقہ کے انتقال کے بعد، وحی کا سلسلہ رک گیا، جس پر محمدؐ نے کئی بار خودکشی کر لینے کا ارادہ کیا، مدینہ میں بھی ہم کو نبی کے ساتھ یہودیوں اور عیسائیوں کا ایک حلقہ نظر آتا ہے۔ یہ لوگ مسلمان ہوگئے تھے یا انھوں نے اسلام کا ساتھ دیا تھا۔ موذن رسولؐ بلال حبشی، ایک عیسائی دولت مند صہیب رومی ایک اور عیسائی سلمان فارسی، اور یگانۂ روزگار یہودی عبد اللہ بن سلام جو کعب احبار کے ساتھ مسلمان ہوئے، یہ تمام لوگ ہم کو اس محفل میں نظر آتے ہیں، ظاہر ہے۔ کہ، ان لوگوں کی گفتگو کا اصل محور تورات وانجیل ہی رہی ہوگی۔ اور یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ نبیؐ اور قرآن، کا ماحول، ہر پہلو سے اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) ہی کا ماحول تھا۔ محمد اور قرآن کا علمی وثقافتی مرجع یہی لوگ تھے نہ کہ وحی الٰہی۔ اور نزول آیات۔"[1]

حداد کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود ونصاریٰ سے استفادہ کیا تھا

[1] الحداد: القرآن والکتاب، قسم ۲۔ اطوار الدعوۃ القرآنیہ۔ ص ۱۰۶۰ - ۱۰۵۹۔

اور جاہلیت کی تمام تر تاریخی دستاویزات اس کے برعکس یہ ثابت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر گرد وپیش کے ماحول کا کچھ بھی اثر نہ تھا۔ انھوں نے تو اپنے ماحول ہی کے مانوس عقیدوں اور روایتوں کے خلاف ایک نئی دعوت پیش کی، جس کی یہود ونصاریٰ اور مشرکین، سب ہی نے مخالفت کی تھی، بشر فارس نے خاص اسی موضوع پر فرانسیسی زبان میں "الشرف عند العرب قبل الاسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اور اس میں اسلام پر یہودی اور مسیحی اثرات کی تردید کی ہے۔

حداد نے بخاری کی عبارت کا مفہوم بھی غلط سمجھا ہے۔ کہ "ورقہ کے انتقال کے بعد وحی کا سلسلہ رک گیا۔" بخاری میں تو یہ ہے کہ کچھ دنوں کے بعد ورقہ کا انتقال ہوگیا، اور وحی کا سلسلہ رک گیا تھا۔" اس عبارت میں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ "ورقہ کے انتقال کی وجہ سے وحی کا سلسلہ رک گیا۔" ان دونوں فقروں میں ترتیب مقصود ہوتی تو دونوں جملوں کے درمیان حرف عطف فَ ہوتا، جو ترتیب کے اعتبار سے تاخیر کے معنی میں آتا ہے۔ حرف وَ (اور) ترتیب زمانی کے لیے استعمال نہیں ہوتا ہے۔

حداد نے اپنے ذاتی رجحان کی وجہ سے، قرآن وانجیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان خلط مبحث سے بھی کام لیا ہے۔ اس کا یہ خیال ہے کہ

"قرآن اور نبی، دونوں مسیح کی نبوت اور انجیل کے پیغام پر پوری طرح ایمان رکھتے ہیں لیکن نبی عربی نے مسیح کی ولدیت کو تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ انھیں مسیح کی کامل معرفت حاصل نہیں ہوئی، ان کا گمان یہ ہے کہ فرزند الٰہ ہونے کے لئے لازمی طور پہ، مسیح کے لیے، اللہ سے جسمانی رشتہ ضروری ہے۔ اور اللہ کے لئے بیوی ماننا اور اس سے اولاد، اور جسمانی رشتہ قرار دینا بھی لازمی شرط ہے قرآن میں ہے بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَکُنۡ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ[2] (الانعام-۱۰۲)
وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کہاں ہوسکتی ہے، حالانکہ اس کی کوئی بیوی تو ہے نہیں۔

[2] المسیح فی القرآن۔ ص ۲۲۸۔

ان کا یہ بھی خیال ہے۔ کہ اللہ کو عالم جسدی کی طرح، روحانی عالم میں بھی فرزندی کی احتیاج ہوتی ہو حالانکہ قرآن میں ہے۔ وما ینبغی للرحمٰن ان یتخذ ولدا ۰ مریم ۹۲ (خدائے رحمان کی شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے۔) دراصل فرزندی کا تعلق عالم جسد سے ہے۔ جس پر اس کے وجود کا پرتو جلوہ فگن ہے، بنی عربی کو مسیح کی فرزندی کی معرفت حاصل ہو جاتی تو وہ ان کو بے تکلف اللہ کا بیٹا تسلیم کر لیتے کیونکہ قرآن میں ہے کہ قل ان کان للرحمٰن ولد فانا اول العابدین ۰ زخرف ۸۱ (آپ کہئے اگر خدائے رحمان کے اولاد ہو تو سب سے اول اس کی عبادت کرنے والا میں ہوں)۔

مذکورۂ بالا آیتوں میں جو باتیں حداد کے عقیدہ وخیال کے مطابق نہ تھیں ان کا سرچشمہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو قرار دیتا ہے۔ اور جن آیتوں کو وہ اپنے عقیدہ وخواہش کے موافق پاتا ہے۔ ان کو قرآن کی طرف منسوب کرتا ہے۔ مثلاً قرآن کی آیت: اولٰئک الذین ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ ۰ انعام ۹۰ (یہ حضرات ایسے تھے جن کو اللہ تعالےٰ نے (صبر کی) ہدایت کی تھی تو آپ بھی ان ہی کے طریقہ پر چلئے)، پر اس نے درج ذیل حاشیہ لکھا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں قرآن بنی عربی کو نسل ابراہیمی کے ان نبیوں کا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے، جن کو اللہ نے کتاب ونبوت اور ایک خاص طرح کی دانش سے نوازا تھا، اللہ کی طرف سے یہ رہنمائی اور ہدایت تورات وانجیل میں موسیٰ وعیسیٰ کے ذریعہ سے موجود ہے۔[1]

(باقی)

---

[1] الحداد المسیح فی القرآن۔ ص ۲۲۸

سلسلۂ اسلام مستشرقین جلد چہارم

تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی رح نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ سب اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔　　قیمت - ۳۰ روپیے

سیرۃ النبیؐ جلد سوم
پر
کچھ اعتراضات اور ان کے جوابات

(از ضیاء الدین اصلاحی)

سیرۃ النبیؐ جلد سوم کی گوناگوں خوبیوں اور خصوصیات پر ہم تفصیل کے ساتھ اپنے گذشتہ مضمون میں بحث کر چکے ہیں۔ لیکن اس جلد پر بعض لوگوں نے کچھ اعتراضات بھی کیے ہیں۔ اس لیے ہم ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا مناسب سمجھتے ہیں۔

اس جلد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا ذکر ہے۔ اور معجزات کے بارہ میں جیسا کہ ہم نے لکھا ہے لوگ عام طور پر افراط وتفریط میں مبتلا ہیں، مخالفین اسلام کی طرح خود مسلمانوں کے عقل پرست اور تجدد پسند طبقہ کے خیال میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی خوارق عادات سے خالی تھی یا آپ کو حسی معجزات کے بجائے صرف معنوی معجزات عطا کئے گئے تھے۔ اس کے مقابلہ میں قدامت پسند طبقہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ومناقب میں اضافہ وکثرت دکھانے کے لئے آپ کی جانب گوناگوں معجزات وخوارق منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کو رطب ویابس اور مستند وغیر مستند ہر قسم کی روایات کو قبول کرنے میں تامل نہیں ہوا ہے۔

اس افراط وتفریط کے مقابلہ میں سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں معجزات کے سلسلہ میں اعتدال

وتحقیق کا نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے، اس لئے نہ تو معجزات کا انکار کیا گیا ہے۔ اور نہ آپؐ کی ہر ہر ادا کو جس میں ذرا بھی عجوبہ نظر آیا، معجزہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بنا پر اس میں آپ کے ان معجزات وخصائص کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جو قرآن مجید سے صراحتاً یا اشارتاً ثابت ہیں یا جو صحیح وثابت حدیثوں میں مذکور ہیں، رہے وہ معجزات جن کا ذکر موضوع، منکر اور ضعیف روایات میں ہے۔ ان سے یا تو اس میں تعرض ہی نہیں کیا گیا ہے۔ یا اگر تعرض کیا گیا ہے۔ تو ان روایات واحادیث پر تنقید کی گئی ہے۔ جن پر ان معجزات کا دارومدار ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کے معجزات بکثرت تھے۔ مگر مصنف سیرت کا بیان ہے کہ انھوں نے اس طرح کے انہی معجزات کو موضوع بحث بنایا ہے جو عام طور سے ہمارے ملک میں مشہور ہیں۔ اور میلاد کی محفلوں میں ان کو بصد شوق وذوق پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

سیرت کے اس معتدل نقطۂ نظر پر پہلے گروہ کا اعتراض یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی معجزات وخوارق سے خالی ہے۔ تو اس میں آپؐ کے اس قدر معجزات کا ذکر کیوں اور کیسے کیا گیا ہے، دوسرے گروہ کو شکایت یہ ہے کہ سیرت میں آپؐ کے ان معجزات سے کیوں تعرض نہیں کیا گیا ہے، جو ضعیف ہی نہیں موضوع اور منکر روایتوں میں مذکور ہیں، اس گروہ کے نزدیک ایمانیات و احکام سے متعلق روایات میں تو تشدد سے کام لیا جاسکتا ہے، مگر فضائل ومناقب پر مشتمل احادیث میں تساہل اور نرمی روا ہے۔

پہلے گروہ کے اعتراض کے جواب میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور خود مصنف سیرت نے بھی جابجا اس کا جواب دیا ہے۔ اس لئے سردست اس کے اعتراضات سے صرف نظر کیا جاتا ہے اور صرف دوسرے گروہ کے اعتراضات پر بحث کی جاتی ہے مگر اس سے قبل دو اصولی باتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ جن کو پیش نظر نہ رکھنے ہی کی وجہ سے سیرت پر اس قسم کے فضول اعتراضات عائد کئے گئے ہیں، ہمارے خیال میں اگر ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو سیرت پر سارے اعتراضات کی جڑ

خود بخود کٹ جائے گی۔

ہم اپنے مضمون میں وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں صحت واستناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے، اس لیے قرآن مجید اور احادیث صحیحہ ہی کو اس کا ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ اور ضعیف وموضوع روایات سے بحث واستناد سے پرہیز کیا گیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابتداً اس سلسلۂ سیرت کے بانی مولانا شبلیؒ کا خیال یہ تھا کہ وہ تمامتر قرآن مجید ہی کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ مرتب کریں لیکن بعد میں انھوں نے اس کا دائرہ وسیع کردیا۔ اور قرآن مجید کے علاوہ جن دوسرے صحیح ومستند ماخذ وذرائع سے اس میں مدد لی ہے، ان کا ذکر سیرت جلد اول کے مقدمہ میں موجود ہے۔ اس اصول کی بنا پر ضعیف اور موضوع روایتوں کے لیے سیرۃ النبیؐ میں کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی تھی اور معاملہ چاہے احکام وعقائد کا ہو یا فضائل ومناقب کا، ضروری ہے کہ ہر ایک میں صحیح وثابت حدیثوں ہی کو بنیاد بنایا جائے اور سیرت نبویؐ کے کسی گوشہ کو بھی ضعیف وموضوع حدیثوں سے داغدار نہ کیا جائے۔

دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ سیرۃ النبیؐ کی جلدیں دراصل جدید علم کلام کی اساس وبنیاد ہیں اور یہ ان اعتراضات وشبہات کے جواب میں لکھی گئی ہیں جو عقل پرستوں، مخالفینِ اسلام اور خصوصاً مستشرقین اور یورپ کے فضلا کی جانب سے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وتعلیمات کے بارے میں کئے جاتے ہیں، اس لیے اس میں آیات واحادیث کی درست اور حقائق پر مبنی تاویل وتوجیہہ بھی کی گئی ہے۔ اور استدلال، سائنٹفک اور دلنشین انداز بھی اختیار کیا گیا ہے۔ جس سے معترضین کو بھی پوری تسلی وتشفی اور اطمینان ہوجائے اور معجزات، ایمانیات، اخروی عالم کے حقائق اور دوسرے مابعد الطبیعاتی مسائل کے بارہ میں کسی شک وانکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ایسی صورت میں سیرت میں رطب ویابس مواد اور کتب احادیث وسیرت کی نامعتبر روایات کو کسی حال میں بھی ماخذ نہیں بنایا جاسکتا تھا، کیونکہ انہی کی بنیاد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وسیرت کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

جو لوگ سیرۃ النبیؐ کے اس نقطۂ نظر اور ماخذ و مصادر کے بارے میں اس کے اصول و طریقے کو سامنے نہیں رکھتے وہ اس پر خواہ مخواہ بے سروپا اعتراضات کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس میں روایات و احادیث کو نظرانداز کردیا گیا ہے اور انھیں تنقید و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ اور ان کی تاویل و توجیہ کی گئی ہے۔

ہمارے پیش نظر اس وقت ترجمان السنۃ جلد چہارم ہے۔ اس کا مقدمہ تمام تر سیرۃ النبیؐ جلد سوم کے رد میں لکھا گیا ہے۔ اور سیرت و مصنف سیرت کا نام لئے بغیر بلا حوالہ اس کے اقتباسات نقل کرکے ان کی تردید کی گئی ہے۔ معلوم نہیں نام لینے میں کیوں تکلف سے کام لیا گیا ہے۔ اور حوالہ نہ دینے میں کیا مصلحت تھی۔

ترجمان السنۃ میں سیرۃ النبیؐ جلد سوم پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں۔ ان کا لب لباب تو یہ ہے کہ سیرت میں ضعیف اور غیر مستند احادیث سے ثابت معجزات کو کیوں نظرانداز کیا گیا ہے۔ اور ضعیف و موضوع روایات پر نقد و جرح سے کیوں کام لیا گیا ہے مصنف ترجمان السنۃ کے خیال میں معجزات کی ایسی تاویل و توجیہ کی گئی ہے جس کا نام تاویل و انکار بھی نہیں تحریف ہے۔ اس کے ثبوت میں جو باتیں کہی گئی ہیں۔ ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سیرت میں معجزات کو اضافی قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ قدرت کے قاہرانہ مظاہر کو بھی زبردستی مادی قوانین کے تحت داخل کیا گیا ہے، معجزات کا تجزیہ و تحلیل کرکے آیات ربانیہ اور تائیدات الٰہیہ کی روح فنا کردی گئی ہے۔

۳۔ معجزات کی حقیقت کھوکھلی کردی گئی ہے۔

۴۔ معنوی معجزات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اور حسی معجزات کو ظاہری سطحی اور اصل اعجاز کی روح سے خالی یا کمزور قرار دیا گیا ہے۔ اس سے حسی معجزات کی اہمیت خود بخود گرگئی ہے۔ اور انھیں

قرآن کی نظر میں بھی بے حیثیت بتایا گیا ہے۔

۵ معجزات کی تعداد کم سے کم بتائی گئی ہے۔

۶ سید صاحب محدثین کی اصطلاح اور فن کے معمولی قواعد سے ناواقف اور حدیث سے بے خبر تھے۔ انھوں نے محدثین کبار سے بدظنی و بدگمانی پیدا کی ہے، کتب دلائل کے مسلّم مولفین سے بداعتقادی ظاہر کی ہے۔ اور ان کے بارہ میں خلاف واقع اور خطرناک طرز نگارش اختیار کی ہے۔

یہ اعتراضات عائد کرنے کے بعد جو نتائج نکالے گئے ہیں، ان کو بھی نقل کردینا مناسب ہوگا۔

مصنف سیرت کے ذہن میں معجزہ کی حقیقت منقح نہیں تھی۔ اس کی صحیح حقیقت تک ان کی رسائی نہ ہوسکی اور وہ اس کی تاریخ سے بھی ناآشنا تھے۔ انھوں نے معجزات کے باب کو دھکا لگانے کی سعی ناکام کی ہے، معتزلہ کی تائید کی ہے، اور وہ معجزات کے خلاف محاذ قائم کرنے والوں میں تھے۔

سید صاحب معنوی معجزات پر زور دیکر حقیقت ناشناسی کے جرم کے مرتکب ہی نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر انکار یا تاویل معجزات کی دلدل میں پھنس گئے ہیں۔ انھوں نے صحیح معجزات کو مشتبہ بنانے کا نیا طریقہ اختیار کیا ہے، شاہ ولی اللہ اور جمہور اور اکابر محدثین کے طریق سے ناواقف تھے۔

جن لوگوں نے سیرۃ النبیؐ جلد سوم کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ وہ خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ان اعتراضات کا اصلیت اور نفس مباحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ زیادہ غور و فکر پر مبنی نہیں ہیں۔ اور نہ سیرت کے نقطۂ نظر کے مطابق ہیں۔ ان کا اصولی جواب تو اوپر گذر چکا ہے۔ تاہم سطور ذیل میں خاص خاص اعتراضات پر مختصر بحث کی جاتی ہے۔

کیا معجزہ اضافی ہے | سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں "دلائل و معجزات اور فلسفہ جدیدہ" کا باب مشہور فلسفی مولانا عبدالباری ندویؒ کا لکھا ہوا ہے، اسی میں بعض پہلوؤں سے معجزہ کو اضافی کہا گیا ہے۔ جس کی تردید ترجمان السنۃ میں اس طرح کی گئی ہے،

"معجزہ خدائی فعل ہوتا ہے۔ اس میں رسول کی قدرت، اس کے اختیار، اس کے
ارادہ اور اس کی توجہ و تاثیر نفسی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ تو پھر یہ فیصلہ بدیہی ہے۔ کہ
معجزہ کبھی اضافی بھی نہیں ہوسکتا۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ جو کل تک کسی نبی کا معجزہ ہو وہ
مادی ترقیات کے بعد معجزہ باقی نہ رہے۔ مثلاً "دوسرے ملک کی آواز سن لینا اگر کل معجزہ
تھا تو وہ "لاسلکی" کی ایجاد کے بعد بھی معجزہ رہے گا۔ کیونکہ معجزہ کی حقیقت میں اس کا "بلاواسطہ
اسباب ظاہری" ہونا رکن لازم ہے۔ لہٰذا اگر آج بھی آلات کے بغیر کوئی شخص دوسرے ملک کی
آواز سن لیتا ہے۔ تو بیشک وہ آج بھی معجزہ کہلائے گا۔ اور اگر بالفرض کل جو آواز سنی
گئی تھی۔ وہ اسی لاسلکی کے اصول پر تھی۔ خواہ اس وقت لوگوں کو اس کا علم تھا یا نہ تھا
تو جس طرح وہ آج اس ایجاد کے بعد معجزہ نہیں، کل بھی اس کو معجزہ نہیں کہا جاسکتا۔"

(ترجمان السنۃ جلد چہارم۔ ص ۱۷)

یہاں معجزہ کے خدائی فعل ہونے کے بارہ میں سیرۃ النبیؐ کا نقطۂ نظر جان لینا ضروری ہے۔
کیونکہ ترجمان السنۃ کے مصنف نے ایک جگہ سیرۃ النبیؐ کے مصنف پر یہ اعتراض بھی عائد کیا ہے کہ وہ
معجزات کو رسول کی طاقت کا نتیجہ سمجھتے ہیں لکھتے ہیں:۔

"اصل حقیقت یہ ہے کہ معجزات پر بحث کرنے والے اگر اس طرف بھی نظر کر لیتے کہ
معجزات رسول کی طاقت سے نہیں خدا تعالےٰ کی قدرت سے ظاہر ہوتے ہیں تو آیات نبوت
کو نوامیس طبیعیہ کے بجائے نوامیس الٰہیہ پر قیاس کر کے دیکھتے اور تمام بحثیں جو ایک محکوم
مادہ کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہیں۔ خودبخود ساقط ہو کر رہ جاتیں۔" (ایضاً۔ ص ۱۱)

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیرت میں معجزات کو خدا کے بجائے رسول کا فعل
قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں یہ ذیلی عنوان قائم کیا گیا ہے۔ "معجزہ کا سبب صرف ارادۂ الٰہی ہے"

اور اس کے تحت مولانا سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"قرآن مجید نہ تو اسباب عادیہ کا منکر ہے۔ اور نہ عالم کے نظام کار کو علل و مصالح سے
خالی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ ان تمام اسباب و علل سے مافوق ایک اور قادر اور ذی ارادہ
ہستی کو فرمانروائے کل یقین کرتا ہے جسکی مشیت اور ارادہ کی قوت سے کائنات کی یہ مشین
چل رہی ہے۔ معجزہ کا سبب اور علت براہ راست اسی کی مشیت اور ارادہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اسی لئے انبیاءؑ نے یہ تصریح کی ہے کہ جو کچھ ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ صرف خدا کی قدرت،
مشیت اور اذن سے ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ ظاہری علل و اسباب کے مطابق ہوں تو وہ
پیغمبر اور خدا کے باہمی ربط و علاقہ کی دلیل کیونکر بن سکتے ہیں۔ کفار ان کو دیکھ کر فوراً
کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو فلاں سبب سے ہوا ہے۔ اس لیے خدائی نشان ہونے کا ثبوت کیونکر
بہم پہنچ سکتا ہے۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۲۸۲)

حضرت سید صاحبؒ نے "مسئلہ اسباب و علل میں افراط و تفریط" کے زیر عنوان جو کچھ
لکھا ہے۔ اس میں بھی اسی حقیقت کو نہایت واشگاف انداز میں دکھایا ہے۔ اور افراط و تفریط کے
بجائے یہ اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔

"قرآن مجید اسباب و علل، مصالح و حکم اور طبائع و خواص کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور
اس جماعت کا ساتھ نہیں دیتا، جو ان چیزوں کا انکار کرتی ہے، اور یہ جانتی ہے کہ ان چیزوں
کے تسلیم کرنے سے قدرت و مشیت الٰہی کے عقیدہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
کا ابطال لازم آتا ہے، حالانکہ یہ تو اس وقت لازم آتا ہے، جب ان اسباب، علل اور
طبائع و خواص کو خدا سے مستقل اور مستغنی تسلیم کیا جائے، اور قرآن اس کی تعلیم نہیں دیتا، قرآن
کی تعلیم یہ ہے کہ اشیا اسباب و علل سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان میں طبائع و خواص ہیں۔ لیکن

یہ اسباب و علل اور طبائع و خواص خود خلاق عالم کے پیدا کردہ اور مقرر کردہ ہیں اور وہ ان ہی پر عموماً کاربند رہتا ہے۔ لیکن وہ اس درجہ ان کا مجبور اور پابند نہیں کہ وہ ان میں تغیر نہ کرسکتا ہو۔ اور کبھی اپنے خاص حکم و ارادہ سے بھی وہ ان کو شکست نہ کرسکتا ہو۔ کیونکہ اس عقیدہ سے کفر پرورش پاتا ہے۔ اور خدا کی قدرت اور عظمت میں فرق آجاتا ہے، اسی لیے ہر موقع پر قرآن مجید نے اپنی تعلیم میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے کہ اسباب و علل کے ساتھ ساتھ خدا کی مشیت اور ارادہ کو پیش نظر رکھتا ہے تاکہ انسانوں میں خدا کی معذوری، مجبوری اور عدم قدرت کا تصور نہ پیدا ہو اور نہ اس کی مشیت و ارادہ پر خود اس کی مشیت و ارادہ کے سوا خارجی پابندیاں عائد ہوں،

ہم نے اوپر اسباب و علل اور طبائع و خواص کے ثبوت میں جس قدر آیتیں لکھی ہیں، غور کرو ان سب میں فعل کی نسبت اللہ تعالےٰ نے خود اپنی طرف کی ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ ان مسبباب کے اسباب و علل اور اشیا کے طبائع و خواص خود اس نے اپنی مشیت و ارادہ اور اپنے حکم و امر سے بنائے ہیں اور ہر جگہ اس کی توضیح کر دی ہے۔ تاکہ ظاہر بیں انسان ان ظاہری علل و اسباب اور طبائع و خواص کو دیکھکر اشیا کی علت حقیقی کا انکار کرکے مبتلائے الحاد یا اسباب و خواص کو مستقلاً شریکِ تاثیر مان کر گرفتار شرک نہ ہو جائے، یہ انبیاءؑ کی تعلیم کا خاص طریقہ ہے۔ اور قرآن نے اس نکتہ کو کہیں فراموش نہیں کیا ہے، یہاں تک کہ انبیائے کرام اور بزرگان خاص کو بھی عادت جاریہ اور ظاہری علل و اسباب کے خلاف باور کرنے میں جب استعجاب اور استبعاد ہوا ہے، تو اللہ تعالےٰ نے ان کو متنبہ کیا ہے۔ اور ان کے اس استعجاب اور استبعاد کو اپنی قدرت اور مشیت کو یاد دلا کر رفع کیا ہے۔"

(سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ صفحہ ۲۷۶ و ۲۷۷)

یہ طویل اقتباس اسی لئے نقل کیا گیا ہے تاکہ مصنفِ ترجمان السنۃ کے اعتراض کی حقیقت پوری طرح ظاہر ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ انھوں نے مصنفِ سیرت کی جانب ایسی بات منسوب کی ہے، جو انھوں نے لکھی نہیں ہے۔ بلکہ نہایت دو ٹوک انداز میں ثابت کیا ہے کہ معجزہ خدائی فعل ہوتا ہے۔ اور وہ اسی کی قدرت و مشیئت سے ظاہر ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ترجمان السنۃ نے سیرت کو پڑھے بغیر ہی یہ اعتراض عائد کر دیا ہے، اور اس کی بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی ہے۔ وہ نہایت کج ہے۔ اسی پر ان کے دوسرے اعتراضات کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر بے وزن ہیں، یہ تو معجزہ کے خدائی فعل ہونے کا مسئلہ تھا۔ اب رسول کے ارادہ، توجہ اور تاثیر نفسی کے مسئلہ کو لیجئے۔ دراصل یہ مصنفِ سیرت کے اپنے خیالات نہیں ہیں بلکہ جدید فلسفہ کے ماہرین کے افکار و خیالات کی انھوں نے ترجمانی کی ہے۔ اور جو مثالیں دی ہیں۔ ان کا مقصد معجزہ کے مابعد الطبیعاتی مسئلہ کو قریب الفہم بنانا ہے۔ مولانا عبد الباری ندویؒ لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر البرٹ مول کا ابھی نام لیا جا چکا ہے۔ اس جرمن فاضل کی کتاب "ہپناٹزم" اپنے موضوع پر سب سے بہتر نہایت محققانہ اور مستند خیال کی جاتی ہے، ڈاکٹر موصوف نے اس کتاب میں دکھایا ہے کہ بہت سے معجزات کی توجیہہ نہایت آسانی کے ساتھ تنویم مقناطیسی سے کی جا سکتی ہے۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۱۵۳)

سیرت میں فلاسفہ کے نظریات پیش کرکے معجزات کی جو توجیہ کی گئی ہے، وہ نہ معجزات کا انکار ہے۔ اور نہ ان میں تحریف بلکہ ان کے متعلق شکوک و شبہات رفع کرکے یہ دکھلانا ہے کہ معجزات عقلاً بھی محال اور مستبعد نہیں ہیں، انہی حکماء و فلاسفہ کے افکار و خیالات کی توضیح اور معجزات کی توجیہہ کے ضمن میں ان کے اس شبہ کا ذکر آگیا ہے۔

"معجزہ اسی وقت تک معجزہ ہے جبتک کہ اس کے نفسی یا مادی قوانین و علل کا انکشاف

نہیں ہوتا۔ لاسلکی پیام رسانی کے انکشاف سے پہلے اگر کوئی شخص ہندوستان میں بیٹھ کر ایک سکنڈ میں امریکہ کا کوئی واقعہ معلوم کر لیتا تو یہ کسی معجزہ سے کم نہ ہوتا۔ لیکن اب معمولی بات ہے۔" (سیرۃ النبی جلد سوم صفحہ ۱۹۶)

اس شبہہ کا جواب سیرت میں یہ دیا گیا ہے۔

"بے شبہہ اس معنی کر کے معجزہ یقیناً اضافی شے ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا، کوئی معجزہ ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا۔ جو اس احتمال اضافیت سے خالی ہو۔ کیونکہ انسان کا علم ہی تمام تر اضافی ہے اگر اس کا علم قطعی و مختتم طور پر تمام قوانین فطرت کا احاطہ کر سکتا تو البتہ کسی حد تک معجزہ کی نسبت یہ مطالبہ بجا ہو سکتا تھا۔ کہ ابد الآباد تک کسی قانون فطرت سے اس کی توجیہہ نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن جب ہمارا علم ہی اضافی ہے تو کوئی معجزہ احتمال اضافیت سے کیسے خالی ہو سکتا ہے"

..... لہٰذا جو شے آج معجزہ ہے بالفرض کل وہ طبعی واقعہ ثابت ہو جائے تو بھی اس سے آج اس کے معجزہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور معجزہ کی غرض و غایت کو پورا کرنے کے لیے اسی قدر کافی ہے۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ صـ۱۹۶)

یہاں دو باتیں الگ الگ ہیں جن کو معترض نے گڈمڈ کر دیا ہے۔ پہلی بات میں ان کا اور سیرت نگار کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یعنی کل تک جو چیز معجزہ تھی۔ اگر آج کی ترقی کے نتیجہ میں اس کی توجیہہ کی صورت پیدا ہو جائے اور اس میں کوئی خاص اعجاز نظر نہ آئے تب بھی وہ چیز معجزہ رہے گی، دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ ایجاد و ترقی کے زمانہ میں اگر وسائلِ ایجاد و ترقی سے کام لیے بغیر کوئی چیز معجزاتی طور پر رونما ہو تو وہ معجزہ کہلائے گی یا نہیں، سیرت میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ اس نسبت سے سیرت کے مصنفین پر جو اعتراض کیا گیا ہے، وہ بالکل بے سر و پا ہے، البتہ اس میں جدید فلاسفہ کا یہ خیال نقل کیا گیا ہے کہ "اب اس میں اس قدر اعجاز نہیں ہے، جو ایجاد سے پہلے تھا۔ بلکہ یہ ایک معمولی بات ہے۔"

اس کو مصنفِ سیرت کی جانب منسوب کرنا صریح زیادتی ہے، سیرت میں اسے نقل کر کے معجزات کو اس حیثیت سے اقرب الی الفہم ثابت کیا گیا ہے کہ جن چیزوں کو کل تک مستبعد خیال کیا جاتا تھا۔ اب جب وہ ممکن ہو گئی ہیں تو کسی کو معجزات میں شک و شبہہ کی گنجایش کہاں باقی رہتی ہے۔

مولانا بدر عالم صاحب کو یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ وہ بے سوچے سمجھے ایک بے بنیاد اعتراض کر کے مصنف سیرت پر طنز کریں کہ "معجزات کی طرف سے جو ابدہی کرنے والوں کے خود اپنے ذہن میں ہی معجزہ کی حقیقت منقح نہیں ہے"۔ (صـ۱۹)

اس تفصیل سے اہل نظر خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ سیرۃ النبیؐ میں معجزہ کو علی الاطلاق اضافی شے قرار نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ ایک خاص نوعیت سے اضافی بتایا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر پوری طرح غور کر لیا جاتا تو یہ مضحکہ خیز اعتراض نہ کیا جاتا۔

ترجمان السنتہ کے دوسرے اعتراضات مثلاً "قدرت کے قاہرانہ مظاہر کو بھی زبردستی مادی قوانین کے تحت داخل کیا گیا ہے۔ یا معجزات کی حقیقت کھوکھلی کر دی گئی ہے۔ یا انھیں بے روح اور اعجاز سے خالی بنا یا گیا ہے۔ اسی طرح معنوی معجزات پر زور دیکر حسی معجزات کی اہمیت کم کر دی گئی ہے وغیرہ بھی سراسر غلط اور عدم غور و فکر کا نتیجہ ہیں، ہم ان کی اور پہلے اعتراض کی تردید کے لیے سیرۃ النبیؐ جلد سوم کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ تاکہ اصحاب علم خود فیصلہ کر لیں کہ معجزات کے بارہ میں سیرۃ النبیؐ کا موقف کس قدر اعتدال و سلامتی پر مبنی ہے، جو لوگ اسے غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ دراصل خود انکے قصور علم و فہم کا نتیجہ ہے۔

"تیسرا احتمال یہ ہے کہ کسی مادی واسطہ کا حذف و اضافہ کئے بغیر براہ راست خدا نے صرف ارادہ "کن فیکون" سے قمر کو شق اور مسیحؑ کو پیدا کر دیا۔ یہی آخری صورت عمیق النظر فلاسفہ و متکلمین اور اہل حق کا مذہب ہے۔ بلکہ تیسرے احتمال کی تو خود کلام مجید کی رو سے گنجایش نہیں۔

اس لیے کہ تنویم کا عمل اس کے عامل کے علم و ارادہ کے تحت ہوتا ہے، اور معجزات میں انبیاء علیہم السلام کے علم و ارادہ کو قطعاً دخل نہیں ہوتا، اسی لئے وہ فرمائش و تحدی پر کسی آیت یا معجزہ کو خود پیش کرسکنے سے عجز کا صاف اعتراف اور اس امر کا غیر مشکوک اعلان کرتے ہیں کہ "آیات تو صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہیں"۔ (اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ - اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ رَبِّيْ) اور اگر رسول ان کو پیش کرتا یا کرسکتا ہے۔ تو صرف اللہ ہی کے براہ راست حکم و اذن سے، خود کسی رسول میں ہرگز اس کی طاقت نہیں کہ اللہ کی مرضی و مشیئت کے بغیر کوئی آیت یا معجزہ پیش کرسکے (مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ) اگر عامل تنویم کی طرح انبیاء علیہم السّلام اپنے ہی علم و ارادہ سے معجزات ظاہر کرتے ہوتے تو حضرت موسیٰ اپنے عصا کو سانپ کی صورت میں ظاہر فرماکر خود اسی سے کیوں ڈرتے اور اس کے پھر عصا بنا دینے کو اللہ تعالیٰ براہ راست اپنی طرف کیوں منسوب فرماتا کہ "ڈرو نہیں، ہم اس کو پھر بھی چھڑی ہی بنا دیں گے"۔ (لَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى)

باقی اور جتنے احتمالات اوپر بیان ہوئے ہیں۔ وہ بھی بس احتمالات و تاویلات ہی کے درجہ میں ہیں۔ لیکن تاویل خواہ بعید ہی ہو تکذیب کے مقابلہ میں اہون ہے۔ لہذا یہ درحقیقت ایسے طفل مزاج عقل پرستوں پر اتمام حجت اور انکار و تکذیب کی راہ سے ان کو بچانے کے لیے ہیں۔ جو بچوں کی طرح مٹھائی (عقل، کا نام لیے بغیر کسی اعلیٰ حقیقت کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے اور جن کی عقل عقل کے نام سے اتنی مرعوب ہے کہ خود عقل کی نارسائی تک بھی رسائی نہیں پاسکتی ہے۔

ورنہ اصل بحث و توجہ کی بات ایک ہی ہے کہ سارے کارخانۂ فطرت کی اساس و بنیاد کوئی بے شعور و بے ارادہ مبدء ہے یا اندر باہر انفس و آفاق میں جو کچھ بھی ہے۔ اور ہوتا ہے تمامتر

بالذات و براہ راست کسی علم و ارادہ والی ذات کی مشیئت و قدرت کا ظہور ہے۔

فلسفہ اور فلسفیانہ عقل کے لیے ایک طرف تو یہ بات بہت پرانی ہوچکی ہے کہ جہاں کہیں جو کچھ بھی ہے یا ہو رہا ہے۔ وہ ایک ہی ہستی کی جلوہ فرمائی و کار فرمائی کے مظاہر ہیں۔ اور فلسفہ تصوریت کی رو سے (جس کا جدید فلسفہ میں خصوصاً دور دورہ ہے) یہ ہستی اسی نوعیت کی ہے جس کو ہم شاعرالذات نفس و روح یا انا و ایغو سے تعبیر کرتے ہیں، باقی مادہ و طبیعت یا مادی و طبعی عوامل و قوانین کی ساری تعبیرات و اصطلاحات دفتر بے معنی ہیں

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

(سیرۃ النبیؐ جلد سوم ص ۱۹۰ تا ۱۹۹)

آگے پھر لکھتے ہیں :-

"غرض یقین معجزہ کی اولین شرط خدا اور غیب کا یقین ہے، اس کے بعد اپنے اپنے علم و مذاق کے مطابق توجیہہ معجزات کی جس طرح یہ پہلی صورت ممکن ہے کہ عام قوانین فطرت (خواہ نفسی یا مادی) ہی کے کسی مخفی عمل کا نتیجہ ہوں۔ اسی طرح مداخلت کی خواہ براہ راست ہو یا بواسطہ حذف و اضافہ" دوسری صورت" بھی قابل قبول ہے انگلستان کے مشہور منطقی ولیم اسٹانل جیونس نے ایک نہایت ضخیم کتاب "اصول سائنس" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں آخری نتیجہ یہ نکالا ہے کہ

"اوپر علم سائنس کی حقیقت و نوعیت کے متعلق جو بحثیں گذری ہیں ان سے ایک نتیجہ جو نہایت صاف طور پر نکلتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم کارخانہ فطرت میں مداخلت خداوندی کے امکان کو کسی طرح باطل نہیں ٹھہرا سکتے ..... جس قوت نے کائنات مادی کو خلق کیا ہے، وہ میرے نزدیک اس میں حذف و اضافہ بھی کرسکتی ہے۔ اس قسم کے واقعات

ایک معنی کر کے ہمارے لئے ناقابل تصور کہے جا سکتے ہیں، پھر بھی یہ اس سے زیادہ ناقابل تصور نہیں ہیں۔ جتنا کہ خود عالم کا وجود ہے۔" مگر جو شخص اس خالق کائنات قوت ہی کا قطعاً منکر ہو، جو سرے سے غیب ہی پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ اور جو آرنسٹ ہیگل (جرمنی کا مشہور ملحد و مادہ پرست) کی طرح خود خدا۔ روح۔ حشر و نشر وغیرہ کو معجزات (بمعنی اوہام و خرافات) قرار دیتا ہو، اور جس کے نزدیک "معجزات کا یقین جہالت و بربریت کی آخری نشانی ہو، جس کا فنا کر دینا ہی علم و تمدن کی فتح ہوگی۔" تو ایسے آدمی کو آپ کسی معجزہ کا اس معنی میں کیونکر یقین دلا سکتے ہیں، کہ وہ کسی غیبی قوت کا آفریدہ ہے۔ یا جس شخص سے ظاہر ہوا ہے۔ اس کے عالم غیب کے ساتھ رابطہ و تعلق (نبوت) کی آیت یا نشانی ہے۔

یقین کی اوپر جو حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اس کے لحاظ سے معجزہ پر بہ حیثیت آیت نبوت کے یقین کرنے کیلئے ضروری ہے کہ غیب پر ایمان ہو جس کے بغیر یقین معجزہ کی خواہش کا پیدا ہونا ناممکن ہے، پھر بھی جس شخص کی نسبت کوئی معجزہ بیان کیا جاتا ہو۔ یا جس سے یہ ظاہر ہوا ہو اس کی زندگی۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ کی تفسیر اور ظاہری و باطنی کمالات کا بجائے خود ایک معجزہ ہو (یہ چیزیں خواہش یقین کے لیے موئیدات کا کام دیں گی) اور سب سے آخری لیکن سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ فرعون و ابوجہل کی طرح دل میں خصومت و عناد، خودی و خود بینی، ذاتی اغراض یا ہوا و ہوس کے موانع یقین نہ موجود ہوں۔ جس طرح ان شرائط کی عدم موجودگی میں کوئی دلیل یقین معجزات پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح ان کی موجودگی میں کوئی دلیل یقین معجزات سے باز نہیں رکھ سکتی۔" (سیرۃ النبیؐ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۰۲ تا ۲۰۴)

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اس دلیل یا آیت کی جو غرض و غایت ہو سکتی ہے۔ اس کی نفسی حقیقت کو یوں سمجھو کہ

مذہب کی بنیاد تمام تر اسرار و غیوب پر ہے۔ سب سے بڑا امر یا غیب بلکہ غیب الغیب خود خدا کا وجود اور اس کی ذات ہے حشر و نشر، جن و ملک، وحی و الہام تمام چیزیں ایک عالم غیب ہیں نبوت نام ہے۔ اسی عالم غیب کے ساتھ روابط و علائق کا، معجزہ میں بھی چونکہ ایک طرح کا غیب پایا جاتا ہے۔ یعنی وہ عالم ظاہری کے سلسلۂ علل و اسباب سے الگ معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے جو شخص غیب پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کا نفس قدرۃً اس یقین کی جانب مائل ہو جاتا ہے کہ جس برگزیدہ انسان سے معجزہ ظاہر ہوا ہے، وہ عالم غیب سے خاص تعلق رکھتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص غیب پر ایمان نہیں رکھتا۔ یعنی سرے سے خدا اور مذہب ہی کا منکر ہے تو ظاہر ہے۔ کہ اس کے لئے معجزہ تصدیق نبوت کی نہ کوئی دلیل بن سکتا ہے۔ اور نہ آیت کسی نبی کے صادق یا کاذب ہونے کا تصفیہ تو اس کے بعد کی شے ہے کہ پہلے آدمی نفس اس امر کا قائل ہو کہ خدا کا کوئی وجود ہے۔ اور وہ ہدایت خلق کے لئے انبیاء کو بھیجتا یا بھیج سکتا ہے۔ جو آدمی نقطہ، خط یا سطح وغیرہ مبادی اقلیدس ہی کا قائل نہیں۔ اس کو تم اقلیدس کی کوئی شکل کیسے سمجھا سکتے ہو۔ جس طرح علوم کی فرعی تفصیلات کے ماننے کے لئے پہلے ان کے مبادی کا ماننا لازمی ہے، اسی طرح تفصیلات مذہب پر یقین کرنے کے لئے پہلے نفس مذہب کا یقین ضروری ہے۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم صفحہ ۱۸۶ و ۱۸۷)

دراصل پوری کتاب میں معجزات کے بارے میں یہی تصور و نظریہ ملتا ہے، اس کے بعد کون یہ باور کر سکتا ہے۔ کہ معجزہ کی حقیقت سیرت کے مصنف کے ذہن میں منقح نہیں تھی اور انھوں نے اسے خدائی فعل قرار نہیں دیا ہے اور قدرت کے قاہرانہ مظاہر کو زبردستی مادی قوانین کے تحت داخل کیا ہے۔ یا معجزہ کی حقیقت کھو کھلی کر دی ہے اور اسے اعجاز سے خالی اور بے روح کر دیا ہے۔ یہ تو خود اعتراض کرنے والے کی اپنی رائے ہے۔ جس سے ان کی یہ توقع پوری نہیں ہو سکتی کہ دوسرے

بھی اسکی تائید کریں۔ سیرۃ النبیؐ انہی لوگوں کے لئے نہیں لکھی گئی ہے۔ جو معجزہ کو مانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ یہ اصلاً جدید ذہن و دماغ کی تشفی کے لئے لکھی گئی ہے۔ اور اس کا مقصد ان لوگوں کو مطمئن کرنا ہے۔ جو ہر چیز کو عقل کی ترازو پر تولتے ہیں۔ اس لئے، اس میں ایسا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ جس کو معترضین تاویل، انکار اور تحریف کا نام دے رہے ہیں۔ تاویل و توجیہ اگر کی گئی ہے۔ تو معجزہ کی حقیقت کو قریب الفہم بنانے اور عقلاً بھی اسے ممکن ثابت کرنے کے لئے کی گئی ہے، سیرت کے مصنف کو کیا خبر تھی کہ ان کی صحیح تاویل و توجیہہ اور معتدل نقطہ نظر کے نافہمی سے وہ معنی پہنا دئے جائیں گے جو ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھے۔

مصنف ترجمان السنۃ کے اس طعن و طنز پر مبنی اعتراض کی حقیقت بھی ملاحظہ کر لی جائے۔ لکھتے ہیں۔

"اس عبارت میں بھی عجیب طریقے پر اپنے عجز و ضعف کا اظہار ہے۔ کیونکہ یہاں معجزہ کو صرف ایک طفل تسلی کے درجہ میں تسلیم کیا گیا ہے۔ حالانکہ شریعت میں اس کا نام دلائل نبوت رکھا گیا ہے، اللہ تعالے نے قرآن کریم میں معجزات دکھانے کی ایک حکمت یہ بھی بیان کی ہے کہ اس سے خصوم کی حجت ختم ہو جاتی ہے۔ اب غور فرمائیے کہ قرآن کی نظر میں جس امر کو "قاطع حجت" سمجھا جائے۔ اس کو دلائل کی فہرست سے خارج کر کے صرف ایک تائید کا مقام دیدینا کتنی نادانی ہے۔ درحقیقت یہ معجزہ کی قاہرانہ حقیقت تک نارسائی کا نتیجہ ہے۔
(ترجمان السنۃ ج ۴ ص ۱۹)

وہ عبارت ملاحظہ ہو جس کی بنا پر یہ ناروا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔

"معجزہ بجائے خود نبوت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ جس شخص میں ظاہری و باطنی کمالات یعنی اصلی خصائص نبوت و اوصاف حمیدہ عام انسانوں کے مقابلہ میں فوق العادۃ حد تک مجتمع ہوتے ہیں، اس کے حق میں معجزہ محض تائید مزید کا کام دے سکتا ہے، اور جس شخص پر نبوت کے اصلی خصائص و کمالات روحانی موثر نہ ہوں وہ بلاشبہ نبی کو بھی زیادہ سے زیادہ

ایک بڑا ساحر قرار دے گا۔ جیسا کہ منکرین نے ہمیشہ کہا ہے کہ ھٰذَا سَاحِرٌ کَذَّابٌ۔
اِنَّ ھٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِیْمٌ (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۱۹۳)

سیرۃ النبیؐ میں اسی مفہوم کو دوسری جگہ اور زیادہ وضاحت سے اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

"اوپر آغاز کلام میں معجزہ کا جو مفہوم بیان کیا جا چکا ہے، اس سے معلوم ہوا ہو گا کہ معجزہ نبوت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے، البتہ جو شخص مذہب کا قائل ہے۔ غیب پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اس سنت الٰہی کا معتقد ہے کہ بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے خدا ان ہی کے اندر سے کسی نہ کسی برگزیدہ بندہ کو اپنے پیام کے ساتھ بھیجتا رہا ہے۔ اس کے سامنے جب کسی مقدس انسان کی طرف سے اس پیام کے حامل یا نبی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور یہ داعی الی اللہ اپنے ظاہری و باطنی کمالات اخلاقیہ و اوصاف حمیدہ کے لحاظ سے عام انسانوں سے برتر نظر آتا ہے۔ تو اس شخص کے دل میں ایمان کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے، اب اگر اس پیغمبر سے کوئی معجزہ نما واقعہ ظاہر ہوتا ہے یا اس کی طرف کسی معجزہ کا انتساب کیا جاتا ہے تو وہ اس کی صداقت کی ایک آیت یا نشانی کا کام دیتا ہے۔ جس سے ذوق ایمان کی تقویت ہوتی ہے۔ اور اس طرح ایمان کے تشنہ کام نفوس کے لیے ایک معنی کر کے معجزہ براہ راست خود نبوت کی نہیں البتہ مدعی نبوت کی صداقت کی ایک نفسی دلیل بن جاتا ہے۔" (سیرۃ النبی۔ جلد سوم۔ ص ۱۸۶)

مذکورۂ بالا اقتباسات کو خوب غور سے پڑھئے۔ اور بتایئے کہ کیا اس میں معجزہ کے دلیل حجت قاطع ہونے کا کہیں انکار کیا گیا ہے۔ اور اسے دلائل کی فہرست سے خارج کیا گیا ہے یا اس کے صرف منطقی دلیل ہونے سے انکار کیا گیا ہے۔ اور دونوں میں جو فرق ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ جہاں تک معجزات کے دلائل نبوتؐ ہونے کا تعلق ہے، سیرت کے مولف کو نہ صرف یہ کہ

اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے پوری طرح مانتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس جلد کو
نبوت کے عام دلائل و معجزات کے لیے مخصوص کیا ہے۔ اور آیات و دلائل نبویؐ کے عنوانات بھی
قائم کئے ہیں۔ اور ان کا تعلق انبیاء علیہم السلام اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتوں سے دکھایا
اور واضح کیا ہے، لکھتے ہیں۔

"قرآن مجید میں اکثر انبیاءؑ کے سوانح وحالات کے ضمن میں ان آیات او معجزات
کا بھی بیان ہے۔ جو ان کو خدا کی بارگاہ سے عطا ہوئے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ آیات و دلائل انبیاءؑ کے سوانح کا ضروری جزء ہیں۔ ..... قرآن مجید میں جن انبیاء
کا تذکرہ ہے۔ ان میں کم و بیش حسب ذیل انبیاءؑ کے آیات و دلائل بیان ہوئے ہیں،
حضرت نوحؑ۔ حضرت لوطؑ۔ حضرت صالحؑ۔ حضرت ہودؑ۔ حضرت شعیبؑ۔ حضرت زکریاؑ۔
حضرت یونسؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلوات اللہ علیہم
اجمعین۔ بعض ایسے انبیاء بھی ہیں۔ جن کے آیات و دلائل کے ذکر سے قرآن خاموش ہے،
مثلاً حضرت اسحٰقؑ۔ حضرت اسمٰعیلؑ۔ حضرت ذوالکفلؑ حضرت الیسعؑ وغیرہ۔ لیکن اس خاموشی
سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ان کو کسی قسم کی نشانی اور دلیل نہیں عطا ہوئی تھی۔ صحیح بخاری
اور صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا "ہر نبی کو کچھ ایسی باتیں دی گئیں۔ جن کو دیکھ کر
لوگ اس پر ایمان لائے۔ ..... قرآن مجید نے انبیاءؑ کے ان معجزات کو عموماً آیت یعنی
نشانی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔" (سیرۃ النبیؐ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۱۱، ۲۱۲)

ترجمان السنۃ کے مصنف کی تغلیط کے لیے ہم چند اور اقتباسات بھی نقل کرتے ہیں۔

"معجزات کا صدور اکثر اس طرح ہوتا ہے کہ معاندین یہ سمجھ کر کہ پیغمبر کاذب ہے
اس سے کسی خرق عادت کا مطالبہ کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ وہ اسکو پیش نہیں کر سکتا۔

اور اس طریقہ سے لوگوں میں اس کی رسوائی ہوگی۔ اور اس کے دعوی کی تکذیب ہو جائے گی۔
لیکن اللہ تعالیٰ اس خرق عادت کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور اس سے پیغمبر کی رسوائی اور فضیحت کے
بجائے اس کی صداقت اور راست بازی اور عالم آشکارا ہو جاتی ہے۔ اور اس بنا پر معجزہ اس کے
صدق پر ایک نشانی اور آیت بن جاتی ہے۔ فرعون نے جادوگروں کو جمع کر کے چاہا کہ حضرت
موسیٰؑ کو رسوا کرے۔ مگر یہی واقعہ حضرت موسیٰؑ کی کامیابی اور فرعون کی ناکامی کا سبب بن گیا
اور سینکڑوں جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر صدائے لبیک بلند کر دی اس بنا پر
معاندین کا وجود اعلان نبوت کی بلند آہنگی اور شہرت کے لئے ضروری ہے" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم صفحہ ۱۱۰)

"الغرض ناقصین اور معاندین کے لیے جس طرح صدق نبوت کے دوسرے دلائل بیکار
ہوتے ہیں معجزہ کی شہادت بھی بیکار ہوتی ہے۔ (ایضاً۔ ص ۱۱۱) اس سے معلوم ہوا کہ
صرف معجزہ ہی نبوت کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ ہر طبیعت صالحہ اور قلب سلیم کے لیے پیغمبر کی
صداقت کی مختلف دلیلیں موثر اور کارگر ہوئی ہیں" (ایضاً۔ ص ۱۱۳)

درج ذیل اقتباس میں متعدد لوگوں کے معجزات دیکھکر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ اگر سیرۃ النبی
کے مصنف معجزہ کے دلیل نبوت ہونے کے قائل نہ ہوتے تو ان واقعات کو کیوں قلمبند کرتے ملاحظہ ہو۔

"ایسے لوگ بھی تھے۔ جو ان روحانی و اخلاقی معجزات کے مقابلہ میں مادی معجزات سے
متاثر ہونے کی زیادہ قابلیت رکھتے تھے۔ قریش کے بہت سے لوگ فتح روم کی پیشین گوئی
کو پوری ہوتی دیکھکر اسلام لے آئے، ایک سفر میں ایک قبیلہ کی عورت آپ کی
انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہتے دیکھکر اپنے قبیلہ میں جاکر کہتی ہے کہ آج میں نے عرب کے
سب سے بڑے جادوگر کو دیکھا۔ اور اسی استعجاب نے پورے قبیلہ کو مسلمان کر دیا۔
متعدد یہودی اس لیے مسلمان ہو گئے کہ گذشتہ انبیاءؑ کی کتابوں میں آنے والے پیغمبر کی

جو نشانیاں بتائی گئی تھیں وہ حرف بحرف آپ میں صحیح نظر آتی تھیں، متعدد یہودی علماء نے آکر آپ کا امتحان لیا۔ اور جب آپ نے از روئے وحی ان کے جوابات صحیح دئے تو وہ آپ کی نبوت پر ایمان لائے۔ ایک شخص نے کہا کہ میں اس وقت آپؐ کو سچا رسول تسلیم کروں گا۔ جب یہ خرمے کا خوشہ آپ کے پاس آکر آپ کی رسالت کی شہادت دے۔ اور جب یہ تماشا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مسلمان ہو گیا۔ ایک سفر میں ایک اعرابی نظر آیا آپؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی اس نے کہا آپ کی صداقت کی شہادت کون دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ سامنے کا درخت اور یہ کہکر آپ نے اس درخت کو بلایا۔ وہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر آپ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اور تین بار اس کے اندر سے کلمۂ توحید کی آواز آئی۔ یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔ سراقہ بن مالک جو ہجرت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتے آرہے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ آپؐ کی دعا سے تین دفعہ ان کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ تو ان کو یقین ہو گیا کہ اسلام کے اقبال کا ستارہ نقطۂ اوج پر پہنچ کر رہے گا۔ چنانچہ خط امان حاصل کیا۔ اور بعد کو مسلمان ہو گئے (سیرۃ النبیؐ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۱۶)

ایک اور اقتباس پر اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے۔

"حامل رسالت اپنے ابنائے جنس کو جو دعوت دیتا ہے اور دنیا کو جو پیام پہنچاتا ہے۔ اس کی سچائی کی واضح ترین دلیل یا آیت اگرچہ خود یہ پیام اور اس کے حامل کا مجسم وجود ہوتا ہے۔ تاہم بہ اقتضائے۔ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ یا بہ لحاظ اتمام حجت اس داعی حق کے تعلق سے کچھ ایسے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ جو عام حالات میں انسانی دسترس سے باہر نظر آتے ہیں۔ اور ان کی توجیہ و تعلیل سے انسانی عقل اپنے کو درماندہ پاتی ہے۔

"حضرت ابراہیمؑ پر آگ سرد ہو گئی۔ حضرت موسیٰؑ کا عصا اژدہا بن گیا۔ حضرت عیسیٰؑ بے باپ کے پیدا ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چشم زدن میں مسجد حرام سے لیکر مسجد اقصیٰ وسدرۃ المنتہیٰ تک کی سیر کر لی۔ ان واقعات کی توجیہہ سے چونکہ عقل انسانی عاجز ہے اس لئے ان میں ایک طرح کا غیب نظر آتا ہے۔ اور جس شخص کے تعلق سے ان کا ظہور ہوتا ہے عالم غیب کے ساتھ اس کے روابط کی نشانی و آیت یا تائید غیبی کا کام دیتے ہیں قرآن مجید کی زبان میں اس قسم کے واقعات کا نام بینات۔ براہین یا زیادہ تر آیات (آیات بینات) ہے۔ محدثین ان کو "دلائل نبوت" سے تعبیر کرتے ہیں اور حکماء و متکلمین کی اصطلاح میں ان ہی کو معجزات کہا جاتا ہے۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم صفحہ ۱۱۹)

کیا ان اقتباسات کے بعد بھی کوئی شخص اس اعتراض کو تسلیم کر سکتا ہے کہ معجزات کو سیرۃ النبیؐ میں دلائل کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اور انھیں نبوت یا نبی کے دلائل تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

معترض کے خیال میں سیرۃ النبیؐ میں معجزہ کو صرف ایک تائید کا مقام دیا نادرست ہے۔ لیکن اولاً تو یہ مفروضہ ہی صحیح نہیں ہے کہ معجزہ کو صرف تائید کا مقام دیا گیا ہے۔ کیونکہ اوپر جو اقتباسات دئے گئے ہیں وہ اس کی تردید کے لئے کافی ہیں ثانیاً سیرت میں جس حیثیت سے معجزہ کو تائید مزید کہا گیا ہے۔ وہ بالکل درست ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کسی ظاہری و مادی نشان کو دیکھکر اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ان کے سامنے جب معراج کا واقعہ بیان کیا گیا تو انھوں نے کفار قریش کی طرح اس کو جھٹلانے کے بجائے اس کی تصدیق کی۔ اس طرح یہ معجزہ ان کے لئے تائید مزید بنا۔ حضرت ابراہیمؑ کو احیائے موتیٰ میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے تائید مزید اور اطمینان قلب کے لیے اللہ تعالےٰ سے اس کی کیفیت بھی جاننی چاہی تھی۔

ظاہر ہے اس حیثیت سے معجزہ کو تائید کا مقام دینا صحیح ہے۔ اور اس پر اعتراض کرنا خود

ایک نادانی ہے۔

کیا سیرۃ النبیؐ میں حسی معجزات کی اہمیت گرادی گئی ہے؟

مولانا بدر عالم میرٹھی مرحوم کا ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ مولانا سید سلیمانؒ ندوی نے معنوی معجزات پر زور دیکر حسی معجزات کی اہمیت کم کردی ہے۔

گو اوپر سیرۃ النبیؐ سے جو طویل اقتباسات نقل کئے گئے ہیں وہ اس کی تردید کے لیے کافی تھے۔ تاہم اس کی اہمیت کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ مولانا بدر عالم صاحب نے اس کا بار بار اعادہ کیا ہے۔ ہم اس اعتراض پر مزید بحث کرتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں۔

"بعض اہل علم کو یہ دیکھکر کہ قرآن کریم معجزہ طلبی کی ممانعت کرتا ہے یہ مغالطہ لگ گیا ہے، کہ شاید یہ ممانعت اس لیے ہے کہ حسی معجزات میں اصل اعجاز کی روح نہیں ہوتی یا کمزور ہوتی ہے۔ اس کے بعد علم کلام میں یہ دیکھکر کہ نبوت اور معجزہ میں کوئی تلازم نہیں ہے۔ یہ مغالطہ اور زیادہ پختہ ہوگیا ہے۔ بلکہ زور قلم میں یہاں تک بھی نکل گیا ہو کہ حسی معجزات کی قرآنی نظر میں کوئی حیثیت و وقعت ہی نہیں۔ حالانکہ سب سے پہلے ایک موٹی سی بات قابل غور یہی تھی۔ کہ قرآن کریم جن معجزات کے مطالبہ کی ممانعت کرتا ہو۔ کیا وہ رسولوں کے معنوی معجزات ہیں؟ اگر وہ معنوی معجزات نہیں صرف حسی معجزات ہیں۔ اور انہی کے مطالبہ کی وہ ممانعت کرتا ہے۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ صاف برآمد نہیں ہوتا کہ ہمیشہ سے معجزات صرف حسی معجزات ہی کو سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان کے اعجاز کو پھیکا کرنا کہاں تک درست اور معقول بات ہے۔ (ترجمان السنۃ۔ ج ۴۔ ص ۹۹)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

"خلاصہ یہ ہے کہ حسی معجزات عوام و خواص سب کی اصطلاح میں حقیقی معجزات ہوئے ہیں۔ وہ کسی کے نزدیک بھی صرف سطحی اور ظاہری نہیں ہوئے۔ خود قرآن کریم نے

ان کا نام "آیات" ہی رکھا ہے یعنی "معجزات و خوارق" اور انبیاء علیہم السّلام کے معجزات میں ان حسی معجزات ہی کا ذکر فرمایا ہے۔ محدثین نے بھی ان ہی کو ہمیشہ اعتنا کے ساتھ جمع فرمایا ہے۔ اور کتب دلائل کا بیشتر حصّہ انہی کے لئے وقف ہوا ہے۔ اہل کتاب اور منکرین کی طرف سے بھی ان ہی کا مطالبہ ہوتا رہا ہے۔ اور اس بنیاد پر ہوتا رہا ہے کہ یہی وہ نوع تھی جو دوسرے انبیاء علیہم السّلام کی نبوتوں میں ثابت ہوتی رہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں شق القمر، اسطوانہ حنانہ۔ انگشتان مبارک سے پانی کے چشمے ابلنا، کھانوں میں برکت۔ پانی میں برکت وغیرہ وغیرہ۔ جو تواتر سے ثابت شدہ واقعات ہیں۔ یہ سب آپ کے حسی ہی معجزات تھے، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ حسی معجزات صرف سطحی اور ظاہری ہوتے ہیں۔ اور قرآن پاک کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں اور وہ آپ کی زندگی میں نمایاں طور پر موجود نہ تھے۔" (ترجمان السنۃ جلد چہارم۔ ص ۳۱)

دراصل یہاں خلط مبحث کر دیا گیا ہے۔ ورنہ حضرت سید صاحبؒ کو نہ حسی معجزات کی اہمیت سے انکار ہے۔ اور نہ وہ ان کو ظاہری اور سطحی قرار دیتے تھے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ قرآن مجید میں خوارق و معجزات کو آیات کہا گیا ہے۔ اور کفار حسی معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ البتہ سید صاحبؒ نے معجزات کی دو قسمیں کی ہیں۔ معنوی و باطنی اور ظاہری و مادی، اور اسی تقسیم کے لحاظ سے انھوں نے معنوی معجزات کو حسی و ظاہری معجزات پر ترجیح دی ہے۔ اور تفصیل سے بتایا ہے کہ اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لئے یہی باطنی آثار و علامات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں، رہے ظاہری نشانات تو وہ سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لئے ہیں۔ جو ہر چیز کو ان ظاہری ہی آنکھوں سے دیکھکر پہچانتی ہیں ان کے نزدیک قرآن مجید بھی معنوی معجزات ہی کو نبوت کی اصلی علامات قرار دیتا ہے۔ اسی لئے معاندین جب آپ سے معجزات طلب کرتے تو محسوس و مادی نشانیوں کے بجائے قرآن مجید انھیں نبوت کی

اصل روح اور اس کے حقیقی آثار و دلائل کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ سید صاحبؒ کو یہاں کوئی مغالطہ نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اسی لحاظ سے انھوں نے بتایا ہے کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں، نبوت کے اصل لوازم وحی، مکالمۂ الٰہی، تزکیہ، انذار، تبشیر، تعلیم اور ہدایت ہیں، اپنے اس مدعا کو ثابت اور مستحکم کرنے کے لئے وہ قرآن مجید سے استدلال بھی کرتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

"اس بنا پر جب معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا ہے تو قرآن مجید نے اکثر اس کے جواب میں نبوت کی اصلی حقیقت کی طرف ان کو متوجہ کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۔ (بقرہ - ۱۴)

اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں خدا خود ہم سے کیوں باتیں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسیطرح کہا تھا، دونوں کے دل ایک ہی قسم کے ہوگئے۔ ہم نے تو نشانیاں لوگوں کیلئے کھول دی ہیں جو یقین کرتے ہیں اے محمدؐ! ہم نے تجھ کو سچائی دے کر نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بنا کر

[illegible]

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۔ (عنکبوت - ۵)

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر اسکے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اترتی ہیں۔ کہدے کہ نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں اور میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں، کیا ان کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۔ (رعد - ۱)

اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشان اس کے پروردگار کی طرف سے کیوں نہیں اتارا جاتا۔ اے محمدؐ تو ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کا ایک ہدایت کرنے والا ہوتا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى (طٰہٰ - ۸)

اور کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا کیا ان کے پاس گزشتہ کتابوں کی گواہی نہیں پہنچی۔ (سیرۃ النبیؐ جلد سوم - ص ۲۱۹ تا ۲۲۳)

یہ اور اسی طرح کی دوسری آیتوں کی وجہ سے سید صاحبؒ نبوت کے معنوی آثار و علامات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا یہ استدلال درست نہیں ہے۔ اور قرآن مجید کے نزدیک معنوی و روحانی آیات کو اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں اللہ تعالےٰ نے کفار کو نفس معجزہ مانگنے پر نہیں بلکہ مادی اور ظاہری معجزات طلب کرنے پر تنبیہ کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ عناد سے طلب معجزہ پر مصر ہیں۔ چنانچہ ان تمام مقامات میں جہاں کفار کی اس طلب معجزہ کا ذکر ہے یہ تصریح موجود ہے۔ اور انھیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ان خوارق سے انھیں تسلی نہ ہوگی۔ ان کو چاہئے کہ نبوت کے اصلی آثار و علامات کی طرف توجہ کریں کہ سعادت مند دلوں کی تسلی ان ہی سے ممکن ہے۔ (باقی)

اردو میں حمدیہ شاعری

از

جناب سید یحییٰ نشیط صاحب کالی (دولت خاں، مہاراشٹر)

مذاہبِ عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ خدا کا تصور کسی نہ کسی صورت میں ہر وقت موجود رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں دورِ جدید کی غیر مہذب اور دورِ عتیق کی مہذب ترین قوموں میں بھی اگر ہم جھانکیں تو وہاں بھی خدا کا تصور ہمیں ملے گا۔

چنانچہ پروفیسر میکس مولر افریقی مذہب کے عناصرِ اعلیٰ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اوجی یا اشانتی قبائل کے نزدیک آسمان سب سے بڑا معبود ہے، جسے وہ شخصی خدا، خالق اور تمام اچھائیوں کا مالک مانتے ہیں"…… بشمین قوم کے لوگ بھی خالقِ حقیقی میں یقین رکھتے ہیں، انکا کہنا ہے کہ اسی نے سب چیزیں بنائی ہیں اور ہم اسکی عبادت کرتے ہیں۔[1] عراق کی قدیم بابلی اور آشوری قوموں میں بھی خدا کا تصور پایا جاتا تھا انکی حمد و مناجات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی عظیم ترین قوت کا نفوذ اور اثر تسلیم کرتے تھے، ان کے یہاں قوت خداوندی رحمٰن اور رحیم اور عفو و درگذر کرنے والی تھی۔

قدیم مصر میں "پتاح" کا تصور خدا کے تصور سے قریب تر تھا۔ اس کے بارے میں ایک قدیم مصری شاعر کا یہ خیال ملاحظہ فرمائیے۔

"کسی باپ نے تجھے پیدا نہیں کیا اور نہ کسی ماں نے تجھے جنم دیا۔ تو نے خود اپنے کو بنایا، بغیر کسی دوسری ہستی کی مدد کے۔"

یونانِ قدیم میں جب تکوینِ عالم کے سلسلے میں غور کیا گیا تو فلاسفۂ یونان اس نتیجے پر پہنچے کہ

خدا ایک ہے۔ جو دیوتاؤں اور انسانوں میں سب سے بڑا ہے۔ اس کا جسم اور دماغ مثل انسان کے نہیں ہے، وہ سراپا بصارت، سراپا سماعت اور سراپا عقل ہے۔" امریکہ کی قدیم ازتیق قوم میں خدا کا یہ تصور تھا کہ "وہ اپنی صیقل شدہ ڈھال میں انسانوں کے کل اعمال دیکھتا ہے، روح کو قبض کرنے کے لیے وہ تاریک راستوں میں مثل ہوا کے دوڑتا ہے، وہ مجیب الدعوات بھی ہے"۔[1]

برادرانِ وطن میں بھی معبود پرستی کا رجحان پایا جاتا ہے، چنانچہ ان کے قدیم مذہبی صحیفہ رگ وید میں پرجاپتی کی حمد اس طرح کی گئی ہے۔

"پرجاپتی نے کاریگر کی طرح اس عالم کو گھڑا۔ دیوتاؤں کے ابتدائی زمانے میں لاشے سے "شے" وجود میں آئی…… ایک اگنی جو بہت سی جگہوں میں روشن ہوتی ہے، ایک سورج جو سب پر چمکتا ہے، ایک شفق ہے، جو ان سب کو منور کرتی ہے وہ جو ایک ہے۔ یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔"

یجروید میں خدا کی توصیف اس طرح کی گئی ہے۔ "خدا ایک ہے وہ غیر متحرک ہے تاہم دماغ سے زیادہ سریع السیر ہے۔ حواس اس تک نہیں پہنچ سکتے، اگرچہ وہ ان میں ہے۔"

اتھروید میں جس خدائے برتر کی تعریف کی گئی ہے وہ "ورن" ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

کہ ———— ورن آقائے اعلیٰ دیکھتا ہے۔

گویا وہ نزدیک ہو جب کوئی شخص کھڑا ہوتا یا چلتا یا چھپتا ہے۔ اگر وہ لیٹے جاتا ہے یا اٹھتا ہے۔ جب دو آدمی پاس بیٹھ کر کانا پھوسی کرتے ہیں، تو بھی شاہ ورن کو اس کا علم ہوتا ہے، وہ وہاں مثل ثالث کے موجود ہوتا ہے…… اگر کوئی آسمان سے پرے بھاگ کر جانا چاہے، تو بھی وہ شاہ ورن سے نہیں بچ سکتا۔"

[1] "Encyclopaedia of Religion" بحوالہ نگار خدا نمبر" لکھنؤ جنوری فروری ۱۹۵۶ء ص ۴۰۔

ایران کے مانوی مذہب میں بھی اللہ کی حمد و ثنا کے گیت گائے گئے ہیں۔ یہودیوں کے یہاں بھی خدائے واحد کا تصور پایا جاتا ہے۔ اور قوم انصاریٰ کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام نے بھی خدائے واحد کی دعوت دی۔ چنانچہ یوحنا کے تیسرے باب کی سترہویں آیت میں بیان ہوا ہے کہ خدا واحد و برحق ہے۔ لوقا کی انجیل میں کہا گیا ہے کہ "کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر مہذب و غیر مہذب قوم میں خدائے واحد کی پرستش کے آثار نمایاں ہیں۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد ـــ

"آسٹریلیا کے وحشی قبائل سے لیکر تاریخی عہد کے متمدن انسانوں تک کوئی بھی اس خدا کے تصور کی امنگ سے خالی نہیں رہا۔ رگ وید کے زمزموں کا فکری مواد اس وقت بننا شروع ہوا تھا جب تاریخ کی صبح بھی پوری طرح طلوع نہیں ہوئی تھی اور حتیوں (Hittites) اور عیلائیوں نے جب اپنے تعبدانہ تصورات کے نقش و نگار بنائے تھے تو انسانی تمدن کی طفولیت نے ابھی ابھی آنکھیں کھولی تھیں۔ مصریوں نے ولادت مسیح سے ہزاروں سال پہلے اپنے خدا کو طرح طرح کے ناموں سے پکارا اور کالڈیا کے صنعت گروں نے مٹی کی پکی ہوئی اینٹوں پر حمد و ثنا کے وہ ترانے کندہ کئے، جو گزری ہوئی قوموں سے انھیں ورثے میں ملے تھے۔"[۴]

لیکن علاوہ اسلام کے ادیانِ عالم میں وحدانیت کا تصور بڑی حد تک ناقص ہی رہا۔ اس کی بڑی وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ پیغمبرانِ دین اور مصلحین قوم سے عقیدت میں غلو ان قوموں میں اس قدر رواج پا گیا کہ "خدائی صفات" بھی ان جلیل القدر اور عظیم ہستیوں سے منسوب کر دیئے جانے لگے تھے۔

---

۴ مولانا ابوالکلام آزاد۔ "غبارِ خاطر"۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ص ۱۲۸ - ۱۲۷۔

زرتشت (۶۶۰ - ۵۸۳ ق۔م) کے یہاں خدائے واحد کا قدیم تصور ہونے کے باوجود یزداں و اہرمن کی ثنویت پیدا ہوگئی۔ قوم ہنود نے مختلف دیوتاؤں کی صورتوں میں ایک خدا کی پرستش شروع کی اور رفتہ رفتہ ایک کے بجائے زمین آسمان کے کئی دیوتا مانے جانے لگے۔ عیسائی قوم میں ایک خدا کا تصور بڑھتے بڑھتے "خدا اور اس کا بیٹا" اور پھر خدا، عیسیٰ، اور روح الامین کی تثلیث میں تبدیل ہوگیا۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے۔ جو باوجود ادیانِ عالم میں سب سے کم عمر ہونے کے خدا کی وحدانیت کا صحیح ترین اور واضح تصور پیش کرتا ہے۔

اس بزرگ و برتر ہستی کے آگے جب انسان خود کو بے بس و مجبور تصور کرتا ہے، تو پھر اللہ کا خوف اس کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے، اسی خوف کے ساتھ جب عقیدت کا جذبہ بھی شامل ہو جائے تو پھر اللہ کی بڑائی اس کی زبان سے نکلتی ہے۔ خوف و عقیدت کا یہی اظہار حمدیہ نغموں اور تمجیدی زمزموں میں کیا جاتا ہے۔ جن سے ادبیاتِ عالم کا بیشتر حصہ بھرا پڑا ہے۔ ان نغموں میں خدا کی مختاری اور انسان کی مجبوری، خدا کی کارسازی اور انسان کی کوتاہ دستی، خدا کی چارہ سازی، اور انسان کی درماندگی خدا کی توصیف اور انسان کی تحقیر کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ دورِ جاہلیت کی عربی شاعری میں کچھ ایسے آثار پائے جاتے ہیں۔ جو "حمدیہ شاعری" کی نشاندہی کرتے ہیں۔ زید بن عمرو بن نفیل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔[۵]

عبادك يخطئون وانت رب   بكفيك المنايا والحتوم

(یعنی تو پروردگار ہے۔ سب لوگوں کا بادشاہ ہے۔ موتیں اور فیصلے تیرے ہی قبضہ میں ہیں)

أربًّا واحدًا ام الف رب   ادين اذا تقسمت الامور

تركت اللات والعزى جميعا   كذلك يفعل الرجل البصير

(یعنی میں ایک پروردگار کو مانوں یا ہزار کو جب کاموں کی تقسیم ہو۔ میں نے لات و عزیٰ

سب کو چھوڑ دیا۔ سمجھدار آدمی ایسا ہی کیا کرتا ہے)

ملائکہ اور حاملینِ عرش کا ذکر بھی اس دور کی شاعری میں خوب ہوا ہے۔ امیہ بن ابی الصلت کے تین اشعار یہاں بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

رجل و ثور تحت یمین رجله — والنسر للاخری ولیث مرصد

والشمس تطلع کل آخر لیلة — حمراء یصبح لونها یتورد

تابی فما تطلع لنا فی رسلها — الا معذبة والا تجلد

(یعنی آدمی اور بیل اس کے دائیں پاؤں کے نیچے ہیں۔ اور گدھ ایک پائے کا اور شیر دوسرے پائے کا محافظ ہے)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے امیہ کے اس شعر کو سن کر فرمایا تھا کہ اس نے سچ کہا ہے، اور اس کے بعد امیہ کے یہ اشعار۔ ع والشمس تطلع .... الخ پڑھے۔

جن کا مطلب ہے: "سورج ہر رات کے ختم ہونے کے بعد صبح کو سرخ اور گلابی رنگ کا نکلتا ہے۔ وہ خوشی سے ہمارے لیے طلوع نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ معذب ہو کر اور تازیانہ کھا کر آتا ہے (یعنی خدا کی قدرت سے مغلوب رہتا ہے)۔

حضرت حسان بن ثابت الانصاری (م ۶۰ھ)، مشرف باسلام ہونے پر اللہ کی حمد اور اس کی بڑائی یوں بیان کرتے ہیں۔

وانت اله الخلق ربی وخالقی — بذلک ما عمرت فی الناس اشهد

تعالیت رب الناس من قول من دعا — سواک الها انت اعلی و امجد

لک الخلق والنعماء والامر کله — فایاک نستهدی وایاک نعبد[1]

---

[1] بحوالہ۔ عربی میں نعتیہ کلام (مرتبہ عبداللہ عباس ندوی)، لکھنؤ ۱۹۰۵ء ص ۲۵۔

"اور ساری مخلوق کا معبود میرا رب اور خالق ہے، ہم زندگی بھر اس کی شہادت دیتے رہیں گے۔ سارے جہاں کے رب تیری شان بڑی ہے، اور تو بلند ہے۔ اس شخص کے دلوں سے جو تیرے سوا کسی اللہ کو پکارتا ہے تو بہت بلند اور بڑائیوں والا ہے حیات بخشی اور نفع رسانی اور ساری حکمرانی صرف تیری ہے، ہم تجھ ہی سے ہدایت مانگتے ہیں۔ اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں"۔

خدا کے متعلق اس طرح کا تصور جدید عربی شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ "العصبة الاندلسیة" تحریک سے وابستہ امریکہ کے عربی شعرا تو حمدیہ زمزمہ خوانی میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ اس تحریک کا مقصد عربی ادب کے قدیم خزانوں سے بے تعلقی اختیار کرنا نہیں ہے بلکہ نئی زندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک فکری ماحول کو کامیابی کے ساتھ عربی میں جنم دینا ہے۔

جہاں تک فارسی زبان و ادب کا تعلق ہے، تو اس میں حمدیہ نغموں کا سراغ اوستا سے ملنے لگتا ہے۔ اس مقدس کتاب کے تمام اجزا "یسنا" "ویسپرد (Visupro)" وندیداد۔ یشت اور خردہ" میں خدائے بزرگ و برتر "اہورمزد"، ایزدوں اور فرشتوں کی حمد و ثنا، پاکی و سچائی، نیکوکاری اور سعی عمل کی تعریف ہے، اور دیوؤں، اہرمن، جھوٹ، خیانت اور فریب کی برائی بیان ہوئی ہے۔

فارسی زبان کو جب عروج حاصل ہوا۔ تو مذہبیات سے اس کا دامن بھر گیا۔ چنانچہ قدیم فارسی شعرا میں شیخ فضل اللہ ابوسعید ابوالخیر (م ۵۴۰ھ ۱۱۵۵ء)، عراقی، سعدی، رومی، اور جامی جیسے مشہور شعرا نے بڑے بلند پایہ حمدیہ شعر لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں ابوالخیر کی ایک حمدیہ رباعی ملاحظہ ہو۔

حق تعالیٰ کہ مالک الملک است — لیس فی الملک غیره مالک

ملے رسانند بیک دگر مارا　　　　انہ قادر علیٰ ذالک[۱]

رومی (م ۶۷۲ھ ۱۲۷۳ء) نے حمد کے سلسلہ میں جو شعر کہے ہیں وہ ضرب المثل کا حکم رکھتے ہیں۔ ایک شعر دیکھئے۔

خود ثنا گفتن زمن ترک ثنا است　　　　کیں دلیلِ ہستی و ہستی خطا است[۲]

خدا کی ہستی کے سامنے ہماری ہستی ہی کیا ہے۔ چنانچہ رومی کا یہ کہنا کس قدر معنی خیز ہے کہ اے خدا اگر میں تیری تعریف کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا بھی وجود ہے، لیکن تیری ہستی کے سامنے میری ہستی کا تصور ہی غلط ہے، چنانچہ میں اگر تیری تعریف کرنے لگوں تو یہ بات تعریف کے بالکل ضد ہو جائے گی۔ یہ ان کا دوسرا شعر بھی کیا تیور رکھتا ہے۔

اے خدا از فضلِ تو حاجت روا　　　　یا تو یاد ہیچ کس بنود روا[۳]

اے خدا تیری یاد کے ساتھ کسی اور کی یاد کرنا جائز و مناسب نہیں، تیرے ہی فضل سے حاجت روائی ممکن ہے۔

عراقی (م ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔) نے بھی عنایتِ الٰہی سے دستگیری کی دعا کس موثر اور لطیف پیرائے میں کی ہے۔

راہ باریکست و شب تاریک و مرکب لنگ و پیر

اے سعادت رخ نمای وای عنایت دستگیر

ز آفتابِ مہرِ خود حمد مرا نورے ببخش

تا چو ذرہ در فضائے حمد تو یابم مسیر

۱؎ ابوسعید ابوالخیر (مرتبہ آقائے م۔ ۱۔ رازی) "تاثرات"۔ لاہور۔ ص ۹۶۔

۲؎ رومی (مرتبہ تلمذ حسین)، مراۃ المثنوی۔ حیدرآباد ۱۹۳۲ء۔ ص ۵۴۳۔

۳؎ ایضاً۔

کے بود کز نورِ تو روشن شود تیرہ دلم؟

کے بر آید شبِ بیچارۂ خوار حقیر

از ہوائے خود بفریادم، اغثنی یا مغیث

در پناہ لطف افتادم، اجرنی یا مجیر[۱]

اب رہے مولانا عبدالرحمٰن جامی (م ۸۹۸ھ ۱۴۹۲ء) تو انھوں نے بھی اللہ رب العزت کی حمد و ثنا بڑے دل نشین انداز میں کی ہے۔

حمد خدائیست کہ از کلک کن　　　　بر ورق باد نوید سخن

نطق و ثنایش چہ تمناست ایں　　　　عقل و تمنائش چہ سوداست ایں

رشتۂ فکرش کہ بود پر گہر　　　　پر بود ایں جا ز گرہ سر بسر

می دہد ایں رشتہ ز سبحہ نشاں　　　　صد گرہ افتادہ درو ہرہ ساں[۲]

عربی و فارسی کی طرح ہی اردو کے شعری سرمایے میں حمدیہ شاعری کو خاص مقام حاصل ہے۔ شعرائے اردو نے اپنے عقیدت و ایمان کے گلہائے معطر حمدیہ اشعار کی لڑیوں میں پرو کر باری تعالیٰ کے اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنہ کے گیسوہائے معنبر سجائے ہیں۔ خدائے عزوجل کی حمد و تمجید کے یہ نقش ہائے دلپذیر اور ثنا و توصیف کے یہ درہائے بے نظیر شعری پیکر میں ڈھل کر ادبی سرمایے میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔ دیگر اصناف سخن کی طرح ہی حمدیہ و نعتیہ شاعری کے سلسلے میں بھی اردو شعرا نے ایرانی شعرا کے اس قبیل کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھا، لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ ان کے تخیل نے دیگر اصناف کی طرح اس صنف میں بھی اپنے ہی دلی جذبات کی اپنے مخصوص انداز میں ترجمانی کی ہے، بلکہ جابجا ایرانی مذہبی روایات

۱؎ عراقی۔ (مرتبہ سعید نفیسی، کلیاتِ عراقی، تہران۔ ۱۳۳۸ھ ش ص ۸۳۔

۲؎ جامی۔ تحفۃ الاحرار۔ نولکشور۔ لکھنؤ۔ ص ۱۲۔

ہٹ کر بھی کچھ باتیں لکھی ہیں۔

اردو شعراء اپنے دیوان کی ابتداء حمد سے کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے، اور آج بھی اکثر و بیشتر اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، برادرانِ وطن کے یہاں چونکہ معبود پرستی کا رجحان ہے۔ اس لئے انھوں نے بھی اس روایت کو اپنایا اور ایسی حمدیں لکھیں جن میں خالص اسلامی رنگ جھلکتا ہے۔

اصنافِ شاعری میں مثنوی کے اجزائے ترکیبی میں حمد و مناجات کا شمار ہوتا ہے۔ مثنوی نگار شعراء نے اس میدان میں اپنے فن کا بڑھ چڑھ کر مظاہرہ کیا ہے، چنانچہ پندرھویں صدی عیسوی کی پہلی مستقل تصنیف نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" اور میرانجی شمس العشاق (م ۹۰۲ھ/ ۱۴۹۶ء) کی تصانیف میں حمدیہ ترانوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں اشرف کی "نوسرہار" مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" ابن نشاطی کی "پھول بن" غواصی کی "مینا ستونتی" اور "طوطی نامہ" نصرتی کی "گلشنِ عشق" اور "علی نامہ" اور فائز کی "رضوان شاہ و روح افزا" میں حمدیہ اشعار کی وافر مقدار موجود ہے۔ شمالی ہند کے شعراء متقدمین اور متوسطین کی مثنویوں میں حمدیہ شاعری پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اردو دورِ جدید کے شعراء کے یہاں بھی حمدیہ نغمے مل جاتے ہیں۔ صوفی شعراء نے حمد کے علاوہ دلکش مناجاتیں بھی لکھی ہیں۔ خدا کے تصوّر کی فلسفیانہ توضیح کرنے والی نظمیں بھی اردو شاعری کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ایسی نظمیں لکھنے والوں میں علامہ اقبال (م ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء) کا مقام بلند تر ہے۔ اس طرح اردو کی حمدیہ شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اولاً شرعی حمد۔ جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور قدرتِ کاملہ کی تعریف پر مشتمل ہے۔

ثانیاً۔ فلسفیانہ حمد۔ اس میں عجمی و اسلامی فلسفے کو بنیاد بنا کر کہی گئی حمدوں کا شمار ہوتا ہے اور

ثالثاً۔ متصوفانہ حمد۔ اس میں صوفیانہ طرزِ استدلال کی حامل حمدوں کا شمار ہوتا ہے جن میں تخاطب کا

انداز عاشقانہ بھی ہے، اور معشوقانہ بھی۔

ذیل میں حمد کی ان تینوں قسموں کا سرسری جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

شرعی حمد جہاں تک شریعت اسلامیہ میں حمد کے مقام کا تعلق ہے۔ تو ہمارے شعراء نے قرآن و احادیث سے اس میں سرمو انحراف نہیں کیا۔ الٰہ العالمین کی ذات و صفات اور اس کی قدرتِ کاملہ کا بیان کرتے ہوئے اردو شعراء نے قرآنی نکات اور حدیث میں بیان کردہ ارشادات کو اپنی شاعری میں کلی طور پر برتا، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ خدا کی حمد و ثنا بیان کرتے وقت بعض اشعار قرآنی آیات کے مطالب سے اتنی مطابقت رکھتے ہیں کہ محسوس ہونے لگتا ہے گویا یہ کسی آیت قرآنی کا منظوم ترجمہ ہیں۔

شرعی اعتبار سے لفظ "اللہ" خدا کا اسمِ ذات ہے۔ قرآن و احادیث میں متعدد جگہ اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "اللہ لا الٰہ الا ھو"، "اللہ واحد القہار" وغیرہ۔ اسی اسم ذات کے تحت خدا کے جملہ صفات آتے ہیں جنھیں "اسماء الحسنیٰ" کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ صفات تو ذاتی ہیں اور کچھ فاعلی۔ مثلاً "الاحد" اللہ کی صفتِ ذاتی ہے۔ تو "الرزاق اور الجبار" وغیرہ صفت فاعلی۔ ہمارے شعراء نے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو مختلف طور پر اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اسی وجہ سے باعتبار موضوع اگرچہ حمدیہ شاعری محدود محسوس ہوتی ہے، لیکن انداز بیان اور خیالات کے تنوع نے اسے بہت زیادہ وسعت بخشی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کی "صفت رحیمی" ہی کو لیجئے کہ ہر شاعر نے اسے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔

ناسخ کہتے ہیں۔ ؎

نہیں حساب ہے جس طرح اس کی رحمت کا
یوں ہی ہمارے گناہوں کا بھی شمار نہیں[1]

یقین کو تو کچھ یقین ہے کہ ؎

---

[1] ناسخ (مرتبہ رشید حسن خاں)، انتخاب ناسخ، دہلی ۱۹۷۲ء ص ۲۷۵

ہمیں دوزخ سے اتنا مت ڈرا زاہد کہ ظاہر ہے
خدا ایسا ستم کب اپنے بندوں پر روا رکھے[۱]

اور میرؔ نے تو واعظ سے صاف صاف کہدیا۔

رکھے ہے شوق اگر رحمت الٰہی کا
خیال چھوڑ دے واعظ تو بے گناہی کا[۲]

دیا شنکر نسیمؔ "حمد باری" کو "ثمرۂ قلم" سمجھتے ہیں۔ ان کی حمدیہ شاعری میں گہری عقیدت اور اخلاص پایا جاتا ہے، لالہ نانک چند کھتری لکھنوی بھی حمد باری تعالےٰ میں سرشار نظر آتے ہیں، یقین میں ڈوبے ہوئے یہ حمدیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

حشر میں جب مرے اعمال تلے اے نانکؔ
تو گراں رحمتِ معبود کا پلہ نکلا

اور

کیا حقیقت تھی مری، میں ایک مشتِ خاک تھا
اپنی رحمت سے کیا تھا تونے مجھ کو سرفراز

حالیؔ اللہ کی رحمتِ بے پایاں سے نا امید نہیں ہیں۔ کیونکہ۔

دیکھا ہے ہم نے عالم رحمت کو غور سے
ہے ششں جہت میں قحط دلِ نا امید کا

شرم کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں
انجام ایک ہوگا شقی و سعید کا

دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر
"لاتقنطوا" جواب ہے "ھل من مزید" کا[۳]

جدید ترقی پسند اور اشتراکی رجحان رکھنے والے شعرا بھی اللہ تعالےٰ کی رحمت کا یقین رکھتے ہیں۔ وقار خلیل کی یہ حمدیہ نظم قابلِ غور ہے۔

---

[۱] یقین (مرتبہ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ) دیوان یقین، علیگڈھ ۱۹۳۰ء ص ۶۳

[۲] میر۔ کلیات میر (جلد اول) رام نرائن لال بینی مادھو۔ الہ آباد۔ ۱۹۷۲ء ص ۶۲۹ دیوان پنجم

[۳] الطاف حسین حالیؔ (مرتبہ۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، کلیات حالیؔ جلد اول لاہور ۱۹۶۸ء ص ۵،

وہ پہلا حرف، جو گنجینۂ اسرار عالم، بستر معنی ہے
وہی تو ابتدا و احساس حرکت اور حرارت ہے

وہ بینا ہے، وہ دانا ہے وہ سرچشمہ ہے رحمت کا
تجلی ہی تجلی ہے، تبسم ہی تبسم ہے

وہی باقی ہے، سب فانی
اسی کے ذکر کو ترسیل کا ابلاغ کہتے ہیں۔

یہ چند مثالیں ہیں، جو شرعی حمد کے ضمن میں دی گئیں۔ اب آئیے فلسفیانہ حمد پر غور کریں۔

فلسفیانہ حمد تصور اللہ فلسفے کا دلچسپ اور بنیادی موضوع رہا ہے۔ مابعد الطبعی تفکرات کی عقدہ کشائی کے لیے اہلِ فلسفہ ہمیشہ سرگرداں رہے ہیں۔ ان کے پاس دلیل و برہان کے بغیر تحقیق کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہوتی۔ اسی لئے اُس "مافوق الفطری ہستی" کے تعلق سے ان کے یہاں جتنی موشگافیاں پائی جاتی ہیں اتنی اور کہیں نہیں ملتیں۔ انھوں نے خدا کی ذات کی تحقیق کے لیے ریاضیات، طبیعیات، منطقیات اور اخلاقیات جیسے موضوعات پر مباحثہ کرکے اور اپنے دلائل و براہین پیش کرکے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کیں۔

عجمی فلاسفہ میں فیثاغورث اور کانسنس نے ریاضیاتی نقطۂ نظر سے اللہ کی وحدانیت ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، ان کا خیال تھا کہ جسطرح تمام اعداد ایک عدد یعنی وحدت سے نکلے ہیں، اسی طرح اللہ بھی ایک ہے جس سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے، یہی وحدتِ مطلقہ ہے، اردو کے دکنی شاعر مختارؔ اور صوفی شاعر امجدؔ حیدرآبادی نے اپنے حمدیہ اشعار میں اسی فلسفیانہ نکتے کی وضاحت کی ہے۔ مختارؔ کہتے ہیں۔

احد ہے ولی دو عدد کا نہیں
عدد کا احد اس کے حد کا نہیں

ولے دو عدد میں ہوا ہے ظہور
عدد ہور احد سب اسی کا ہے نور[۱]

امجدؔ کی یہ رباعی بھی ملاحظہ کیجئے۔

ذرّے ذرّے میں ہے خدائی دیکھو
ہر بت میں ہے شانِ کبریائی دیکھو

---

[۱] مختارؔ۔ معراج نامہ (قلمی) ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد۔ ورق ۱۔ ب

اعداد تمام مختلف ہیں باہم ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو

اس رباعی کی شرح خود حضرت امجدؔ نے یوں بیان کی ہے۔

"۲ مجموعہ ہے ۱+۱ کا اور ۳ مجموعہ ہے ۱+۱+۱ کا قس علیٰ ہذا۔ اکائی ہر عدد میں موجود ہے اور (۱) خود عدد نہیں ہے کیونکہ عدد حاشیتین کے مجموعہ کو کہتے ہیں جیسے (۲) اس کا ایک حاشیہ (۱) ہے اور دوسرا حاشیہ (۳)۔ (۱) اور (۳) کا مجموعہ (۴) اور (۴) کا نصف (۲) ہوتا ہے۔ فافہم۔"[1]

طبیعیاتی بنیادوں پر بھی بعض فلاسفہ نے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً علی محمد ابن محمد ابن یعقوب الملقب ابن مسکویہ (م ۱۰۳۰ء) نے ارسطوؔ کی تقلید کرتے ہوئے محرک اولیٰ یا علت العلل کا نظریہ پیش کیا جس سے یہ ثابت کیا گیا کہ کائنات کی تمام چیزیں متحرک اور تغیر پذیر ہیں۔ لہٰذا ان کا ایک محرک اولیٰ بھی ہے، جو غیر متحرک ہے۔ اور یہی خدا ہے۔ غالبؔ کا یہ شعر اسی نظریہ کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے[2]

اسی طرح برگساں کے نظریہ استدام یا فلسفہ زماں میں بھی طبعی نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ برگساں کا یہ نظریہ مشہور حدیث "لاتسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ" سے مطابقت رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اسی نظریہ کو قرآن کے اختلاف لیل و نہار سے ملا کر پیش کیا ہے۔ چنانچہ اقبالؔ جہاں یہ کہتے ہیں۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

وہاں ع — نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ" کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔

[1] سید حسین احمد۔ رباعیات امجدؔ۔ جلد اول۔ طبع پنجم حیدرآباد۔ ص ۳۰
[2] غالب۔ دیوان غالب ایوان ایڈیشن۔ الہ آباد۔ ص ۱۰۹۔

اخترالایمان کے یہاں بھی وقت کے تصور کو خدا سے جوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ اپنے مجموعہ کلام "بنت لمحات" کے پیش لفظ میں وہ کہتے ہیں۔

"میری ان نظموں میں 'وقت' کا تصور اس طرح ملتا ہے جیسے یہ بھی میری ذات کا ایک حصہ ہے . . . . کبھی یہ گذرے ہوئے وقت کا علامیہ بن جاتا ہے۔ کبھی خدا بن جاتا ہے . . . . یہ تصور نہ مایا کا تصور ہے۔ نہ فنا کا . . . . یہ ایک زندہ و پائندہ ذات ہے جو اننت ہے۔"[3]

منطقیاتی زاویہ نظر سے بھی فلسفیوں نے دلائل کی جانچ پرکھ کر کے خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ کتب السیر میں امام فخرالدین رازیؒ کے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے کہ امام رازی کا کسی گاؤں میں ایک بوڑھی عورت کے پاس سے گذر ہوا۔ وہ چرخہ اپنے سامنے رکھ کر کسی خیال میں غرق تھی۔ امام رازی کے پوچھنے پر وہ بوڑھیا چونک پڑی اور کہنے لگی کہ میں غور کر رہی ہوں کہ آخر میرا چرخہ کیوں نہیں چلتا۔ امام رازی نے اپنے ہاتھوں سے اس چرخہ کو گھمایا اور چرخہ چلنے لگا۔ اتنے میں بوڑھیا کو شرارت سوجھی اور اس نے چپکے سے چرخے کو دوسری سمت گھمایا جس کی وجہ سے چرخہ رک گیا۔ امام رازی نے جو طاقت لگائی تو چرخہ ٹوٹ گیا۔ انھیں بڑا افسوس ہوا۔ لیکن بوڑھیا کہہ اٹھی کہ چرخہ ٹوٹ گیا ہے تو بن جائے گا۔ لیکن اس چرخے نے ایک پیچیدہ مسئلہ حل کر دیا ہے کہ خدا ایک ہے۔ اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اگر اس کائنات کے چرخے کو دو خدا چلاتے تو دونوں کی کشاکش اور زور آزمائی میں یہ چرخہ ٹوٹ جاتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم کی حسب ذیل آیت میں اس نظریہ کی وضاحت اس طرح ملتی ہے۔

وَمَا کَانَ مَعَہٗ مِنْ اِلٰہٍ اِذًا لَّذَھَبَ اور اس (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ کوئی اور

[3] اخترالایمان۔ بنت لمحات۔ بمبئی ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۵۔

کُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ (مومنون ۵)

معبود نہیں ورنہ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوق کو ساتھ لے لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتے۔)

اردو شعراء نے خدا کے متعلق اس منطقیانہ نکتے کی وضاحت اپنے اشعار میں نہایت عمدگی سے کی ہے اسمٰعیل میرٹھی کا یہ شعر بطور مثال پیش خدمت ہے۔

سخت فتنہ جہان میں اٹھتا　　کوئی تجھ سا تیرے سوا نہ ہوا[1]

ایموئل کانٹ نے اخلاقی بنیادوں پر خدا کے وجود کو بحال کرنے کی کوشش کی تھی اس کا نظریہ مشہور حدیث "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ" سے مطابقت رکھتا ہے، اس نظریے کی وضاحت بھی اردو شعراء نے مختلف پیرائے میں کی ہے مثلاً علامہ اقبال اپنی نظم "مدنیت اسلام" میں رقمطراز ہیں۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے　　یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال　　عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوزِ دروں[1]

"خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات" کے متعلق اقبال فرماتے ہیں۔

قہاری و غفاری، قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

یہ چار عناصر صفاتِ مولا اگر "خاکی و نوری نہاد" بندے میں آجائیں تو پھر مومن بندے کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال نے خدا کے متعلق تمام فلسفیانہ استدلال و نظریات میں "ایمان" کا عنصر ملا کر "فلسفہ الٰہ" کو قرآنی تصور الٰہ سے جوڑ دیا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کی حمد وثنا کے

---

[1] اسمٰعیل میرٹھی۔ کلیات اسماعیل میرٹھی ۱۹۱۰ء ص ۲۴۴ [2] اقبال (علامہ) کلیات اقبال (ضرب کلیم) پرویز بکڈپو۔ دہلی۔

ہمہ جہتی پہلو نکال کر اپنی حمدیہ شاعری کو چمکایا ہے۔

متصوفانہ شاعری حمدیہ شاعری کی تیسری قسم ہمارے نزدیک متصوفانہ حمد ہے۔ جس طرح فلسفے نے دماغ کے سہارے خدا کی کھوج کی ہے۔ اسی طرح تصوف میں "قلب" یا "دل" کے سہارے خدا کو تلاش کیا جاتا ہے۔ جو زیادہ تر جذبات پر منحصر ہوتا ہے۔ تصوف کی بنیاد دراصل روحانیت پر ہے یہی روحانی علم ہند و عجم میں "ویدانت" اور باطنیت کے نام سے مشہور ہوا اور اسلام میں تصوف کے نام سے۔

صوفیوں کے یہاں اللہ تعالےٰ کے ذکر و اشغال کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مراقبہ میں خدا اور اپنی ذات پر غور و فکر کرایا جاتا ہے تسبیحات و اوراد کی خاص طور پر مشق کرائی جاتی ہے۔ جسے روح کی غذا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غرض کہ اللہ کی بڑائی بیان کرنا، اس کی یاد کرنا اور اسی کے ذکر میں رطب اللسان رہنا، صوفیوں کے شعائر اور پاکیزہ عادات میں شمار ہوتے ہیں۔

باری تعالےٰ کا تصور صوفیوں کے یہاں تین طرح کا ملتا ہے۔ اس اعتبار سے صوفیا تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایجادیہ۔ وجودیہ اور شہودیہ۔ ایجادیہ کے نظریہ کے مطابق کائنات کی تخلیق "لاشے" سے ہوئی ہے۔ اس لئے خالق مخلوق سے جدا ہے۔ اس نظریے کے ماننے والے "ہمہ از اوست" کے قائل ہیں۔ انسان خدا کی مخلوق و محکوم اور خدا اس کا خالق و حاکم ہے۔ ایجادیوں کا کلمہ "لا معبود الا ھو" ہے۔ ان کے یہاں سالک روحانی سفر طے کرنے کے بعد بھی انا عبدہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

وجودیوں کے یہاں کائنات میں بجز خدا کے کوئی نہیں ہے۔ خالق اور مخلوق کا جوہر ایک ہے، اس نظریہ کے مبلغ فرقۂ باطنیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا۔ کہ "وجود حقیقی فقط ایک ہے اور وہ اللہ تعالےٰ ہے۔ اور باقی ہر وجود اس کا ظل ہے، جو اپنی بقا کے لیے اس پر منحصر ہے۔ لہٰذا ایک اللہ ہی واجب الوجود ہے۔ باقی ہر شے وجود ممکن۔ ہر وجود ممکن چونکہ عدم سے وجود میں آتا ہے، اس لیے وہ حادث ہے۔ اور ہر حادث قدیم یا حقیقی نہیں ہو سکتا۔ اس جگہ یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وجود

ممکن حقیقی نہیں تو پھر وہ باطل ہوا۔ متکلمین نے قرآن کی روشنی میں اس اشکال کو اس طرح دور کر دیا کہ۔

"وجودِ ممکن نہ تو حقیقی ہے نہ باطل بلکہ موجود بالحق، یا قرآن کی اصطلاح میں تخلیق بالحق ہے"[1]

خدا کے وجود کا یہی نظریہ "وحدت الوجود" کہلاتا ہے۔ اس نظریے کے حامی "لاموجود الاھو" کا کلمہ بلند کرتے ہیں۔ یہی کلمہ تصوف کی زبان میں "ہمہ اوست" کہلاتا ہے۔ اس نظریے کے تحت خدا اور انسان میں وہی نسبت سمجھی جاتی ہے، جو قطرہ اور دریا میں ہے۔ یا حباب اور پانی میں ہے۔ وحدۃ الوجودی نظریے کے مطابق عشق۔ عاشق اور معشوق تینوں ہی ایک ہیں۔ ان کے یہاں عشق کی آخری منزل میں طالب و مطلوب کا تعلق۔ ع

من تو شدم، تو من شدی　　من تن شدم، تو جان شدی

کا ہو جاتا ہے۔ سالک ہمیشہ "خدا" کے وصل کا خواہاں "فراق" کے احساس سے تڑپتا رہتا ہے۔

اس نظریے کے مبلغین میں ذوالنون مصری (م ۲۴۶ھ / ۸۵۹ء)، بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ / ۸۷۵ء)، ابو سعید خراسانی (م ۴۴۰ھ / ۱۰۴۹ء)، محی الدین ابن العربی (م ۶۵۶ھ / ۱۲۴۰ء) اور الجیلی (م ۸۳۲ھ / ۱۴۲۸ء) کافی مشہور ہوئے۔ اس نظریے کو عوام ان اس سمجھنے میں قاصر رہے، اور بعض دینی گمراہی کا شکار ہو گئے، اس لیے علماء کے ایک طبقہ میں اس کی برابر مخالفت ہوتی رہی۔ اس نظریے کے مخالفین میں شیخ رکن الدین۔ علاء الدولہ نے بغداد میں اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے ہندوستان میں شہودیہ دبستانِ خیال کی بنا ڈالی تھی۔ وحدۃ الوجودی نظریے کے رد میں ان لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ "عالم و مافیہا آئینہ کے مانند ہے جس میں صفاتِ الٰہی کا عکس نظر آتا ہے"۔ سالک کو تمام موجودات میں ذاتِ الٰہی نظر آتی ہے۔ اور وہ ایک خدا کا مشاہدہ ان چیزوں میں کرتا ہے۔ خدا کا غیر ان کے یہاں معدوم ہے، خدا کے متعلق اس طرح کا تصور شہودیہ نظریہ کی اساس ہے۔

تصوف میں خدا کے متعلق ایک اور نظریہ ہے۔ اس کی رو سے خدا کو ـــ

---

[1] ارمغان ملک۔ فارابی کا نظام فکر جلد دوم دہلی ۱۹۷۱ء۔ ص ۲۱۲۔

(۱) حقیقتِ انتہائی سمجھا گیا ہے۔

(ب) اس حقیقتِ انتہائی کو "جمال" یہ حسنِ ازلی قرار دیا گیا ہے۔

(۳) یہ حقیقتِ انتہائی ہی "نورِ ازلی" یا "نورِ مجرد" بھی ہے۔

اللہ تعالےٰ کے تعلق سے تصوف کے ان نظریات کی توضیح اردو کی حمدیہ شاعری میں نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔ اردو شعراء نے چونکہ مندرجہ بالا میں سے کسی خاص نظریہ ہی کو اپنی حمدیہ نظموں کا محور نہیں بنایا۔ بلکہ اکثر و بیشتر ان کے یہاں ایک ہی حمد میں تمام نظریات کے حامل اشعار بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اردو کے ان شعراء کو ہم ایجادیہ، وجودیہ یا شہودیہ وغیرہ خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ تاہم ان نظریات کی توضیح کرنے والے چند حمدیہ اشعار ہم بطور مثال ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

(ایجادیہ)(۱)　تیرے نسیمِ لطف سے گل کو شگفتگی

وابستہ تیرے حکم پہ چلنا نسیم کا　(کلیات شیفتہ ص ۱)

---

(۲)　تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا

کیسی زمیں بنائی، کیا آسماں بنایا

پاؤں تلے بچھایا کیا خوب فرشِ خاکی

اور سر پہ لاجوردی اک سائباں بنایا

مٹی سے بیل بوٹے کیا خوشنما اگائے

پہنا کے سبز خلعت ان کو جوان بنایا　(کلیات اسمٰعیل میرٹھی ص ۲۲)

(وجودیہ)(۱)　دیکھ تو کثرت میں وحدت کو ذرا

سو مقاموں میں یہ چھائی ہے ہوا

(میر حسن۔ رموز العارفین۔ ص ۳)

(۲) موجود اگرچہ نام خدا وہ کہاں نہیں
تس پر بھی آہ یاں تو کسو پہ عیاں نہیں ہے
(دیوانِ اثر صفحہ ۲۰)

(۳) دلِ ہر قطرہ ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
(دیوانِ غالب ایوانِ ایڈیشن صفحہ ۳)

(۴)
(شہود دید) (۱) جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
(دیوانِ درد۔ صفحہ ۱)

---

(۲) ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت
یاں بھی شہود تیرا، واں بھی حضور تیرا (ایضاً صفحہ ۱۳)

---

(۳)
(خدا بحیثیت حسنِ ازلی) الف (۱) حسن تیرا ہوا ہے عالمگیر
جم ہے نے آج نا سکندر ہے (دیوانِ فائز صفحہ ۲۱)

(۲) محو دیدار ترے حسن کے ہو جاتے ہیں
تابِ آئینے تجھے دیکھ کے کب لاتے ہیں
(دیوانِ محسن اورنگ آبادی صفحہ ۶۳)

(ب)
(نور اولیٰ) (۱) تاباں ہے اس نگاہ سوں مج دل میں نور آج
جس نور میں ہوا ہے ہر اک کوہ طور آج (انتخابِ حاتم صفحہ ۱۱۹)

---

(۲) مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع، سراپا ہو اگر حرفِ زباں کا (انتخابِ سودا صفحہ ۳۴)

آخر میں یہ کہنا ہے کہ مجموعی حیثیت سے اردو کی حمدیہ شاعری جلال و جمال کی حامل۔ نشاط و انبساط اور کیف و سرور کی شاعری ہے، جو عقیدت و ایمان کے لحاظ سے نہ صرف بصیرت افروز ہے، بلکہ عشق کے والہانہ جذبات کی صحیح ترجمان ہونے کی وجہ سے قاری کے دل کی تاریک گہرائیوں میں سرور و کیف کی شمعیں روشن کر دیتی ہے۔

باب التقریظ والانتقاد

حنائے علی گڑھ

مرتبہ

ڈاکٹر فرحت فاطمہ۔ ایم اے، پی ایچ ڈی، لکچرار شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی

حنائے علی گڑھ یہ ۱۶۶ صفحے کا مجموعہ مکاتیب ہے۔ جس میں پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور دیگر مشاہیر کے خطوط شامل ہیں۔ اور جسے میسور کے ممتاز نقاد اور ادیب پروفیسر محمد عبد القادر نے پندرہ صفحے کے دلکش مقدمے اور حواشی کے ساتھ بنگلور سے شایع کیا ہے۔ ملنے کا پتہ اردو لائبریری سنٹر، ۳، سٹی مارکیٹ، بنگلور، اور بک ڈپو انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد دہلی ہے۔ کتابت۔ طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ۔ قیمت چالیس روپیے۔

خطوط کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ سیاسی۔ مذہبی۔ ادبی۔ علمی اور نجی۔ لیکن سب سے اچھے خط وہ ہوتے ہیں جو کسی کی فرمایش پر نہ لکھے جائیں، بلکہ از خود لکھ جائیں، اچھے خط اور اچھے شعر میں اہتمام اور زبردستی کو دخل نہیں ہوتا۔ جو دل سے نکلتا ہے وہی کاغذ پر اتر جاتا ہے۔ اچھا شعر اور اچھا خط کڑی کمان کا تیر ہے۔ وہ بس ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ تصنع کو دخل ہے اور نہ تکلف کو۔ ہم دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اچھا خط حُسنِ اتفاق کا نام ہے۔ ہمارے ناقص عشق سے یار کا حُسن بے نیاز ہے۔ اُس کے حسین چہرے کو نہ آب و رنگ کی ضرورت ہے۔ اور نہ خال و خط کی۔ ع

بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

اس مجموعہ کے تمام خطوط نجی ہیں۔ لکھنے والے کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ کبھی منظرِ عام

آئیں گے۔ اسی لیے ان میں بے ساختگی اور بے ریائی ہے۔ اور بلا کا خلوص ہے۔

حنائے علی گڑھ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی علی گڑھ سے باہر جانے کے لیے بہت کم آمادہ ہوتے تھے۔ اگر مجبوراً جاتے تو آخری ٹرین سے جاتے اور پہلی ٹرین سے واپس آجاتے علی گڑھ سے اس غیر معمولی وابستگی کے پیش نظر، قادر صاحب نے رشید صاحب کو میرزا عبد القادر بیدل کا یہ شعر لکھا ؎

دنیا اگر دہند نہ جنبم زجائے خویش　　　　من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

اور اس میں ذرا سے تصرف کی اجازت چاہی۔ ع

من بستہ ام حنائے علی گڑھ بہ پائے خویش

رشید صاحب پھڑک گئے۔ اور بیدل سے ہم نامی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھا

"شعر عبد القادر بیدل از تصرف بہ عبد القادر علیگ"

اس مجموعہ میں عبد القادر صاحب کا ایک بسیط مضمون بھی رشید صاحب پر شامل ہے۔ جو ۱۹۴۰ء میں ساقی دہلی کے سالنامہ میں شایع ہوا تھا۔ اور جو عبد القادر صاحب کی نقادی اور بالغ نظری کا ثبوت ہے۔ یہ بہترین خراجِ عقیدت ہے۔ جو ایک عزیز طالب علم اپنے محترم استاد کو پیش کر سکتا ہے۔ در اصل پوری کتاب ایک قرض ہے جو گرہ و نیم باز پر تھا۔ اور جس کو عبد القادر صاحب نے، اپنے شفیق بزرگوں اور مخلص دوستوں کے سامنے بڑی سلیقگی دیانت داری، خوش مذاقی اور خوبصورتی کے ساتھ اتارا ہے۔

ان خطوں میں ۴۴ برس کی کہانی ہے۔ جس کی طرف صرف حشیم سخن سے اشارہ کیا گیا ہے، یہ تعلقات ۱۹۴۲ء میں شروع ہوئے۔ جب عبد القادر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اور اپنی غیر معمولی لیاقت خوش ذوقی اور فہم و فراست کی بدولت

صفِ اول کے لکھنے والوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ تعلقات رشید صاحب ان کے حلقہ اور نیاز مندوں سے بھی بہت گہرے ہو گئے تھے۔ اور ان کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی ہو گئی تھی۔ ان خطوں کے پیچھے جو فضا ہے وہ بڑی مخلصانہ اور دل آسا ہے۔ اس میں بڑی خیر و برکت ہے۔ رخِ سخن پر لطف و مرحمت بھی ہے۔ اور وہ محبت بھی جو اب ناپید ہے خطوں میں جتنے افراد ہیں وہ حافظ کے لفظوں میں عشق کے ہم راز اور مے و مینا کے ہم نفس ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے وائس چانسلر، گورنر اور نائب صدر کی حیثیت سے بھی خط لکھے ہیں۔ اور سب میں مہر و محبت کا وہی عالم ہے۔ جو اول دن تھا۔ بلکہ جیسے جیسے وہ ترقی کے بام بلند تک پہنچتے گئے۔ ان کی محبت اور ان کے خُلق میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی شرافت اور ان کا انکسار اس پیڑ کی طرح تھا جو پھلوں سے لدا ہوا ہو اور بوجھ سے نیچے کو جھکتا جائے۔ عبد القادر صاحب پر رشک آتا ہے کہ ان کے کاتبینِ خطوط رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ذاکر حسین، علامہ نیاز فتح پوری۔ خواجہ احمد فاروقی۔ سلطان حیدر جوش وغیرہم ہیں۔

اس مجموعے میں نہایت دلچسپ حواشی اور فٹ نوٹ بھی ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کا ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"حضرت جوانی بہ دل است نہ بہ سال۔ میرا تو مدعا یہ تھا کہ آپ اس نگارِ آتشیں رخ کو چار پر بلائیں گے۔ اور کہیں گے کہ یہ (نور انٹرنیٹی) امریکہ جا رہی ہیں۔ اس روز ڈھنگ سے بات نہ ہو سکی۔ فیلو شپ کی گفتگو اس سطح پر زیادہ مناسب تھی"

اس پر عبد القادر صاحب نے جو حاشیہ چڑھایا ہے۔ وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں۔

"میں نے فاروقی صاحب کو کھانے پر بلایا۔ ان کے ہمراہ ڈاکٹر پٹنائک تھے۔ اور ان کی حسین و جمیل سکریٹری بھی تھیں۔ حسین و جمیل کتابی چہرہ۔ نرگسی آنکھیں۔ ترا شیدہ گھنگھریالے

بال، سرخ و سفید رنگ، عمر ۲۱ - ۲۲ کی۔"

"فاروقی صاحب کا اس لڑکی کو غالب کے الفاظ میں نگارِ آتشیں رخ سے تعبیر کرنے کی داد نہیں دی جاسکتی۔"

"فیض کو مدحِ زلف و لب و رخسار کرنے میں تامل تھا۔ اس لئے کہ جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس۔"

لیکن فاروقی صاحب کے پاس لسان الغیب کا فتوی ہے۔ میرے نزدیک یہ گناہ نہیں ہے، روئے نکو کی تعریف تو بیاضِ مسیحا کا ایک نسخہ ہے۔ جس سے عمر بڑھ جاتی ہے۔

روئے نکو معالجۂ عمر کوتہ است — ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند

عبد القادر صاحب کا خیال ہے کہ خواجہ احمد فاروقی کے خطوط اگر شائع ہو جائیں تو وہ ان کی تمام تصانیف پر بھاری ہوں گے۔ یہی رائے قبلۂ محترم ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی کی ہے۔ جو ام القری یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں ادبیاتِ عربی کے پروفیسر ہیں۔ اور لیڈز (Leeds) یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں، اور جو ان کے خطوط کو کتابی شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ع

من دانم و دل داند ایں نامہ چہا دیدم — صد بار ز بے تابی وا کردم و پیچیدم

اس زمانہ میں جب کہ علم مجلسی اٹھتا جا رہا ہے۔ اور بے فرصتی کی بدولت دیوان خانے کی محفلیں سرد ہو گئی ہیں، اور تار اور ٹیلی فون کی افزونی سے خط کتابت کی اعلیٰ روایتیں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ حنائے علی گڑھ ایک نعمت ہے۔ جس میں عمر رفتہ کے بعض خوشگوار لمحوں کو جاوداں بنا دیا گیا ہے، ان میں تمام خطوط ادب کا شاہکار نہیں ہیں، اور نہ ہو سکتے تھے لیکن ان میں خلوص کی دولت ہے، وفا کی خوشبو ہے اور رشید احمد صدیقی اور ذاکر صاحب کی حیثیت تو بلا شبہ پیرِ مغاں اور مامنِ وفا کی ہے، عبد القادر صاحب ماشاء اللہ "جوان بخت جہاں" ہیں۔ ان کے متعلق صرف یہی عرض کیا جاسکتا ہے۔ ؎

قدح پُر کن کہ من از دولت عشق — جوان بخت جہانم گرچہ پیرم
نہاں پُر شد فضائے سینہ از دوست — کہ فکرِ خویش گم شد از ضمیرم

مطبوعاتِ جدیدہ

رسالہ نوریہ سلطانیہ :- مرتبہ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ، تصحیح، تعلیق و تقدیم ڈاکٹر محمد سلیم اختر صاحب تقطیع کلاں کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۰، قیمت تحریر نہیں۔ پتہ: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، پاکستان۔

یہ ہندوستان کے مشہور عالم اور محدث کبیر حضرت شاہ عبد الحق دہلویؒ کی تصنیف ہے جو ابھی تک غیر مطبوع بلکہ تقریباً ناپید تھی، مگر اب پاکستان کے فاضل محقق ڈاکٹر محمد سلیم اختر نے اس کے متن کی تصحیح کر کے اسے اپنے عالمانہ مقدمہ و تعلیقات کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، شاہ صاحب نے یہ رسالہ فرمانروائے ہند نور الدین محمد جہانگیر کے لیے لکھا تھا۔ اس میں بادشاہ کے فرائض، سلطنت کے ارکان، قواعد، آداب اور اس کی بھلائی و خیر خواہی کی مفید اور اہم باتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ رسالہ ایک مقدمہ کے علاوہ پانچ فصل پر مشتمل ہے، مقدمہ میں پہلے بادشاہ کے دربار میں حاضری کے آداب اور اس کے عادل، سایۂ خدا اور جانشینِ مصطفیٰ ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت و عظمت واضح کی گئی ہے، جس سے ظاہر ہے کہ وہ بادشاہت کو بالکل ہی غیر اسلامی طرز حکومت خیال نہیں کرتے تھے، پھر رسالہ کی تالیف کا مقصد اور اس کے مباحث کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ پہلا فصل ارکانِ سلطنت کے بیان میں ہے جو یہ چار چیزیں ہیں۔ خزانہ۔ لشکر۔ لشکر میں اتفاق، عدل، اور مخلوق پر ظلم و ستم نہ کرنا۔ شاہ صاحب نے ان سب کی اہمیت و ضرورت بتائی ہے۔ دوسرے فصل میں ان چاروں امور کے حصول و استحکام کے طریقے بیان کر کے دکھایا ہے کہ انہی کی بدولت سلطنت مستحکم اور پائندہ ہو سکتی ہے۔ تیسرے فصل میں ان امور، آداب و اوصاف کا ذکر ہے۔ جن کو بادشاہ کو

متصف ہونا چاہیے۔ اس میں اور باتوں کے علاوہ زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ قوت اور زور بازو میں بادشاہ کو سب سے فائق اور شجاعت و بہادری میں سب سے ممتاز ہونا چاہیے، جسمانی قوت پیدا ہونے کے وسائل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسے پہلوانوں کی طرح صبح کو ورزش کرنی چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ ورزش اگر جہاد کی نیت سے ہو تو بادشاہ کے لیے یہ تہجد سے افضل ہے۔

چوتھے وصل میں اجرائے امور سلطنت کے سلسلہ کی مفید باتیں تحریر کی گئی ہیں، آخر میں گذشتہ سلاطین کی عدل پروری، عفو، حلم، کرم، احسان، قوت اور شجاعت کے واقعات و حکایات درج ہیں، ڈاکٹر محمد سلیم نے اپنے مقدمہ میں شاہ صاحب کے حالات اور کارناموں پر محققانہ بحث کرکے رسالہ کا تعارف کرایا ہے اور اس کے بعض اہم مضامین کی نشاندہی کی ہے، اور ان تین نسخوں کی خصوصیات تحریر کی ہیں، جن سے مقابلہ و مراجعت کرنے کے بعد یہ متن شائع کیا گیا ہے۔ اسی حصہ میں شاہ صاحب کی شرح مشکوۃ اشعۃ اللمعات کے پہلے صفحہ اور دہلی میں ان کی آرام گاہ کا عکسی فوٹو بھی ہے۔ تعلیقات آخر میں درج ہیں۔ ان میں متن کے مندرجات کے مآخذ کی نشاندہی، آیات و احادیث کی تخریج اور رسالہ میں مذکور اشخاص و مقامات کے بارہ میں معلومات قلمبند کئے گئے ہیں۔ تعلیقات کے بعد اسماء و اعلام کے تین اشاریے بھی ہیں، ڈاکٹر محمد سلیم نے یہ رسالہ بڑی تحقیق و محنت سے ایڈٹ کیا ہے، اس کا اندازہ مآخذ و مراجع کی طویل فہرست سے بھی ہوتا ہے، شروع میں مرکز کے ڈائرکٹر کی تحریر میں یہ سخن گسترانہ باتیں بھی آگئی ہیں کہ پیش نظر رسالہ اور قدما کی دوسری تصنیفات میں بعض ایسے واقعات درج ہوتے ہیں جن کی تاریخی حیثیت سے کوئی اصلیت نہیں ہوتی بلکہ وہ افسانہ ہوتے ہیں، دوسرے شاہ صاحب نے عباسی خلفاء ہارون رشید، مامون اور معتصم باللہ جیسے ستمگروں کا ذکر عظمت و احترام سے کیا ہے۔ اور انھیں امیر المومنین بھی لکھا ہے۔ جب کہ انھوں نے شیعی اماموں پر ہی نہیں بلکہ ائمہ سنت

پر بھی ظلم و بیداد کیا ہے، مرکز کے مدیر کا نام معلوم نہیں ورنہ اندازہ ہوتا کہ اس تحریر میں کون سا زاویۂ نگاہ کام کر رہا ہے۔ ان کی پہلی بات کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس چیز کو وہ بے اصل سمجھتے ہیں، ممکن ہے چھان بین کے بعد وہ بے اصل نہ ہو، باقی ان خلفا کے امیر المومنین ہونے میں کیا شبہ ہے؟ اور شاہ صاحب نے ان کی جس پہلو سے تحسین کی ہے۔ وہ قابل اعتراض نہیں ہے، اگر کسی حکمران کی کمزوریاں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہوں اور اس کی خوبیاں حد شمار سے باہر ہوں تو وہ اپنی چند کمزوریوں کے باوجود اچھا حکمراں ہے۔ اس نادر رسالہ کی اشاعت پر اہل علم کو ڈاکٹر محمد سلیم اختر اور مرکز تحقیقات دونوں کا شکر گذار ہونا چاہیے۔

فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان جلد چہارم | مرتبہ جناب احمد منزوی صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ، صفحات ۲۸۲، قیمت ۱۰۰ روپیہ، پتہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، پاکستان۔

اس فہرست کی پہلی جلد کا ان صفحات میں ذکر آچکا ہے، دوسری اور تیسری جلد موصول نہیں ہوئی ہے۔ یہ دراصل پاکستان کے مختلف کتبخانوں میں موجود فارسی مخطوطات کی فہرست ہے، زیر نظر جلد کی ابتدا نمبر ۳۸۷۱ سے اور انتہا ۴۴۲۶ پر ہوئی ہے، اس طرح اس میں ۵۵۵ فارسی مخطوطات کا ذکر تین حصوں (۱۶ تا ۱۸) میں ہے۔ پہلے حصہ ہندوی میں ہندوؤں اور ان کے مذہب سے متعلق کتابوں کے نام درج ہیں، جن کے اکثر مصنفین بھی ہندو ہیں، دوسرا حصہ فلسفہ عملی یعنی اخلاق و آداب کی کتابوں پر مشتمل ہے، اور تیسرے حصہ کا عنوان پیشہا و آداب پیشہ وران ہے، اس میں آہنگری، سپاہگیری، بافندگی، سقائی، جواہر شناسی، شکار و میر شکاری، تیر اندازی و کمانداری، کفش دوزی، خوراک پزی، دلاکی، ہرگنی وغیرہ سے متعلق کتابوں کی فہرست ہے۔ کتابوں کے نام حروف تہجی کے مطابق درج ہیں اور ہر مخطوطہ کے بارے میں ضروری معلومات کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ کن کن پاکستانی کتبخانوں میں

موجود ہیں۔ یہ جلد بھی فہرست نگاری اور کتاب شناسی کے ماہر احمد منزوی صاحب نے محنت اور سلیقہ سے مرتب کی ہے، آخر میں تین فہرستیں ہیں پہلی کتابوں کے اور دوسری مصنفین کے ناموں کے اعتبار سے ہے اور تیسری متن میں وارد ناموں کی ہے۔ مرکز تحقیقات نے یہ فہرست شائع کرکے مفید علمی خدمت انجام دی ہے۔

حیات مصلح الامت:۔ مرتبہ۔ مولانا اعجاز احمد اعظمی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۰۰، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ۵۰ روپیے، ناشر دائرۃ الاشاعت، خانقاہ مصلح الامت، الٰہ آباد۔

مولانا شاہ وصی اللہ صاحب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اجل خلفا میں تھے۔ جو ان کے بعد خود بھی ایک بڑے شیخ طریقت اور اسرار تصوف کے واقف و ماہر ہوئے اور ایک بڑے طبقہ کو ان کی ذات سے فیض پہنچا۔ اس سے پہلے "تذکرہ مصلح الامت" پر معارف میں تبصرہ ہوچکا ہے۔ اب مولانا کے جانشین مولانا قاری محمد مبین صاحب کی نگرانی میں یہ دوسری سوانح عمری مرتب کی گئی ہے۔ گو پہلی کتاب بھی کمتر نہ تھی تاہم ع ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است، پیش نظر کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں صاحب سوانح کی پیدائش سے وفات تک کے حالات و واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، اسمیں مولانا کے خاندان، ولادت، تعلیم، حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضری و وابستگی، تعلیم سے فراغت کے بعد مختلف مدارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے اور شادی کا تذکرہ ہے پھر اپنے شیخ مولانا تھانویؒ کے ایما سے اپنے وطن فتح پور (اعظم گڈھ) میں فروکش ہوکر خلق خدا کی اصلاح و تربیت کے لئے وقف ہوجانے کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں شب و روز کے معمولات، خانقاہ کے اصول و ضوابط، طالبین و سالکین کے لیے ہدایات، دستور العمل اور نظام الاوقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور مجلسوں کا حال اور اصلاحی و تبلیغی کام کے لیے قرب و جوار کی بستیوں میں بھی گاہے ماہے تشریف لیجانے کا ذکر ہے۔ اس سے دعوت و اصلاح کے کام میں مولانا وصی اللہ صاحب کی مستعدی، باقاعدگی اور بیداری مغز

کا پتہ چلتا ہے۔ مگر افسوس کہ فتح پور میں ان کی اصلاحی و دینی سرگرمیوں میں بعض لوگ رخنہ انداز ہونے لگے، ان کے رکیک انداز اور مسلمانوں کو تفرقہ و انتشار سے بچانے کے لئے مولانا پہلے گورکھپور اور آخر میں الٰہ آباد تشریف لے گئے جہاں ان کا دائرہ فیض اور زیادہ وسیع ہوگیا۔ اس کتاب کے پہلے حصہ میں اس کی اور دوسری جگہوں میں مولانا کے سفر کی روداد بیان کی گئی ہے، اور آخر میں دوبارہ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہونے اور جہاز میں انتقال فرما جانے کے المناک سانحہ کا ذکر ہے۔ ان سادہ واقعات کے ضمن میں متعدد ایسے حالات و کیفیات بھی زیر تحریر آگئے ہیں، جن سے مولانا کی عظمت و بلند پائیگی، دینی و اصلاحی جذبہ اور دوسری ممتاز خوبیوں کا اندازہ ہوتا ہے، دوسرے حصہ میں مولانا کے ذوق و مزاج، ان کی خصوصیات خلوت گزینی، ذوق عبادت، ذات نبوی سے شیفتگی، قرآن مجید سے تعلق، زہد و اتقا، مریدین اور وابستگان پر لطف و شفقت امت کی اصلاح کے لئے فکرمندی، حزم و تدبر، علمی ذوق اور حسن قبول وغیرہ کی داستان سنائی ہے، ایک حصہ میں اس عہد کے دوسرا کابر علماء و مشائخ سے مولانا کے روابط بیان کئے ہیں، اسی سلسلہ میں ان کے استاذ مولانا ابراہیم بلیاوی کے انکے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے اور دونوں کی باہمی خط و کتابت کا ذکر ہے، اسی حصہ میں مولانا کی کرامتوں اور دعا کی مقبولیت، سلوک و تصوف کی لطیف باتوں اور اصلاح باطن کے بعض نکات بھی بیان ہوئے ہیں۔ اس کے ایک حصہ میں مولانا کی ظاہری و معنوی اولاد کا تذکرہ بھی ہے۔ جس میں تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا ہے، آخر میں چند موثر و دلپذیر وعظ نقل کئے گئے ہیں۔ اور مولانا تھانویؒ کے انکے نام کے تین خطوط بھی دے گئے ہیں، ان پر حضرت کا مختصر مگر بلیغ اور حکیمانہ جواب بھی ہے، ایک بڑا پر اثر مضمون مولانا عبد الباری ندوی کا "چار ہفتہ ایک کہف میں" صدق لکھنؤ سے شامل کیا گیا ہے، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، اس میں مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کی دعوت و اصلاح کی بعض نمایاں خصوصیات مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں تحریر کی ہیں، مولانا وصی اللہ صاحب

جس پایہ کے مرشد و مصلح تھے، اور انھوں نے جس مناسب انداز میں دلسوزی، انہماک اور اخلاص سے اصلاح و دعوت کا کام انجام دیا ہے۔ اس کتاب سے اس کا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس لحاظ سے یہ بڑی مفید ہے۔ البتہ حدود و مراتب کا خیال رکھنا بڑا نازک مگر نہایت ضروری امر ہے، اس کتاب میں کہیں کہیں حد سے بڑھی ہوئی عقیدت مندی کی وجہ سے اس کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ چنانچہ مولانا کے وطن چھوڑنے کی مثال ہجرت نبوی سے دی گئی ہے اور پھر دوبارہ وطن میں واپسی کو فتح مکہ سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ کتاب فتح پور اور الہ آباد میں مولانا کی قیام گاہ، ان کی مجلس اور اس میں نشست گاہ، مسجد و مدرسہ اور خانقاہ نیز خطوط کے عکسی فوٹو سے بھی مزین ہے۔

پورنیہ کے دو ولی : مرتبہ۔ جناب اکمل یزدانی، جامعی صاحب، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۴۰، قیمت۔ آٹھ روپیہ، پتے (۱) سلیمان اکیڈمی، بہادر گنج، مقام وڈاکخانہ بہادر گنج، ضلع پورنیہ (بہار)، (۲) اپنا کتب خانہ کٹیہار (بہار)، (۳) صادق کتاب گھر، کچہری روڈ، پورنیہ۔ بہار

یہ کتاب پورنیہ سے تعلق رکھنے والے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے دو خلفاء کا تذکرہ ہے، اس کے مرتب جناب اکمل یزدانی کو لکھنے پڑھنے کا اچھا ذوق ہے۔ اور وہ عرصہ سے پورنیہ کی تاریخ کا مطالعہ کرکے اس کے بارہ میں معلومات اکٹھا کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے یہاں کے ممتاز اشخاص کے بارہ میں بھی بڑا مواد جمع کیا ہے، لیکن حالات کے غیر مساعد ہونے کی وجہ سے ان تمام لوگوں کا تذکرہ شائع کرنے کے بجائے ابھی انھوں نے اسی دور کے دو بزرگوں کا یہ تذکرہ شائع کیا ہے، پہلے بزرگ مولانا منور حسین صاحب کا تذکرہ زیادہ مفصل ہے اس میں ان کے وطن، خاندان، ماحول، تعلیم و تدریس، سلوک و تصوف، قومی، ملی، دینی اور تبلیغی خدمات کے علاوہ ان کے منتخب ارشادات و ملفوظات اور بعض تقریروں کا خلاصہ دیا ہے،

اس میں مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ان کے بیعت ہونے اور پھر حضرت شیخ الحدیث سے اجازت و خلافت پانے اور ان دونوں بزرگوں سے روابط کی تفصیل بھی ہے، دوسرے بزرگ مولانا امام الدین صاحب کے بھی خاندانی حالات اور حصول تعلیم کی روداد بیان کی ہے، اور پھر حضرت شیخ سے ان کے تعلق، رمضان کے معمولات اور تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں پورنیہ کے بارہ میں مختصر تاریخی و جغرافیائی معلومات اور اسلام کی اشاعت میں صوفیاے کرام کی تبلیغی جد و جہد کا تذکرہ ہے، اس سلسلے میں کئی صوفیاے کرام اور ان کے سلاسل، اشاعت اسلام کی مرکزی جگہوں، خانقاہوں اور تکیوں کا ذکر بھی آگیا ہے، یہ معلومات بوکانن ہملٹن صاحب کے پورنیہ اکاؤنٹ ۱۸۰۹-۱۰ء سے ماخوذ ہیں، اس میں پست طبقوں کے قبول اسلام کا سبب اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کے نفرت و حقارت آمیز رویے کو بتایا گیا ہے۔ یہ کتاب اچھی ہے، مگر کتابت وطباعت کی متعدد غلطیاں ہیں۔

نظریۂ ادب اور ادیب : از جناب شاہ رشاد عثمانی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۳۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۰ روپیے۔ پتہ۔ منیجر دار الکتاب بیت الرشاد، نیا کریم گنج، گیا، بہار۔

جناب شاہ رشاد عثمانی کے ادبی و تنقیدی مضامین کے اس مجموعہ میں انہی شعراء اور ادیبوں کی کاوشوں پر بحث و تبصرہ کیا گیا ہے۔ جو ترقی پسندی اور جدیدیت کے شور و غوغا میں بھی پاکیزہ اور تعمیری ادب کو فروغ دینے میں مشغول ہیں، اسی حیثیت سے اس میں پروفیسر عبد المغنی کی تنقید نگاری، حفیظ میرٹھی کی غزل گوئی، سہیل زیدی کی نظم نگاری اور م نسیم کے طنزیہ مضامین کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد تعمیری ذوق و رجحان رکھنے والے کئی افسانہ نگاروں اور نعت گو شعراء کے خصوصیات فن کا جائزہ لیا ہے۔ اختر اورینوی کے ناول حسرت تعمیر اور ڈاکٹر سید عابد حسین کے ڈرامہ پردۂ غفلت کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ مصنف کی تحریری عمر زیادہ نہیں ہے۔

اس پے زبان و بیان اور خیالات میں جو کور کسر ہے۔ وہ مشق کے بعد رفع ہو جائے گی۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مصنف کی بہتر صلاحیت اور اچھے ذوق کا ثبوت ہے۔

اردو کے کلاسیکی شعرا، جلد اوّل: مرتبہ، جناب ایم۔ حبیب خاں صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۲۰، قیمت ۱۸ روپیے۔ پتہ۔ انڈین بک ہاؤس علی گڑھ۔

جناب ایم حبیب خاں لائبریرین کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند نے اردو کے اہم اور بلند پایہ شعرا پر مفید تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ اس کا پہلا حصہ ہے جس میں ولی۔ میر، سودا۔ درد۔ میر حسن۔ مصحفی۔ انشاء، جرأت، ناسخ۔ اور آتش کی شاعری کے اہم پہلوؤں اور نمایاں خصوصیات پر مختلف مشہور اہل قلم کے اچھے اور متوازن مضامین اکٹھا کیے گئے ہیں۔ لائق مرتب نے شروع میں ہر شاعر کے مختصر حالات کے علاوہ اس کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔ آخر میں دلی و لکھنو کے دبستان شاعری کے عنوان سے ایک مختصر مگر مفید مضمون بھی درج ہے۔ جن شعرا پر اس کتاب میں تنقیدی مضامین درج ہیں۔ لائق مرتب نے ان پر لکھی گئی مفید تنقیدی کتابوں اور مضامین کی فہرست بھی دیدی ہے۔ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ طلبہ کیلئے خاص طور پر بہت مفید ہے۔

بچوں کی کہانیاں حصہ اول و دوم: مرتبہ جناب اکبر رحمانی صاحب، تقطیع اوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ہر دو حصے ۳۲، قیمت تحریر نہیں، پتہ، مکتبہ آموزگار، کاشانہ بیبی، ۳۰ بھوانی پیٹھ جلگاؤں۔

جناب اکبر رحمانی کو علمی و تعلیمی مسائل سے دلچسپی بھی ہے اور وہ اردو کی خدمت کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کی کوشش سے جلگاؤں میں ایجوکیشنل اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے، اس کے ماتحت اردو میں تعلیمی و تدریسی موضوعات اور بچوں کے ادب پر مفید کتابیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی اور بچوں کے لیے سبق آموز کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس سے بچوں میں اردو کے فروغ اور ان کی ذہنی و دماغی نشو و نما میں مدد ملے گی۔

"ض"

جلد ۱۳۸ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۶ء عدد ۳

مضامین